"ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ بخدا مجھے ایک لفظ بھی اِن کتابوں کا یاد نہ رہ گیا۔ خُدا نے تمام مسائل کلامیہ میرے دِل سے محو کر دیئے اور قلب علم لدُنی سے لبریز کر دیا۔" (تصوفِ اسلام، عبد الماجد دریا بادی، ص ۹۱)

مولانا عبد الماجدؒ اس پر حاشیہ لکھتے ہیں :

"غالباً غلط (روایت) ہے۔ اس لئے کہ علم کلام بہر حال دین ہی کی خدمت اور اہم خدمت کیلئے ہے۔ اگر اس کے بجائے فلسفہ کا نام ہوتا، تو روایت قرینِ قیاس ہو جاتی۔"

اور یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ روایت، جو عبد الماجدؒ دریا آبادی کو غلط معلوم ہوئی، مندرجہ ذیل تذکرہ نگاروں نے اسے درج فرمایا ہے :

۱۔ بہجۃ الاسرار ــــــــ نور الدین علی شنطوفی ، ص ۳۲، ۳۳

۲۔ قلائد الجواہر ــــــــ علامہ محمد بن یحییٰ الحلبی ، ص ۳۰

۳۔ نفحات الانس (فارسی) ــــــــ عبد الرحمٰن جامی ، ص ۳۵۷

۴۔ تحفہ قادریہ ــــــــ شاہ ابو المعالی ، ص ۲۶، ۲۷

(بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۱۴۴)

یہ بھی خیال رہے کہ عبد الماجد صاحبؒ خود بھی اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں اور اس موضوع پر کتاب تصوفِ اسلام بھی تالیف فرمائی ہے۔

سریؒ سقطی کا راہِ عام اور خاص کا معیار

"فرمایا اس منزل کی طرف ایک راہِ عام ہے اور ایک راہِ خاص ہے۔ راہِ عام تو یہ ہے کہ پانچ وقت نماز با جماعت ادا کی جائے۔ مال ہو تو اس کی زکوٰۃ دی جائے۔ ماہ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔ حج بیت اللہ کیا جائے۔ خدا کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا جائے اور راہِ خاص یہ ہے کہ ان کے ساتھ ترکِ دنیا کی جائے۔ کسی آرام و آسائش کی طرف توجہ نہ دی جائے اگر کچھ دیا بھی جائے، تو نہ لیا جائے۔ غیر اللہ سے پوری طرح رُوگردانی کی جائے۔ دل کو اللہ کے ساتھ لگایا جائے۔"

"یہ سن کر شیخ احمد نے کہا: "اے استاد! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ میں دوسرا راستہ اختیار کرتا ہوں چند روز بعد ایک بوڑھی عورت بدحال و گریاں خدمتِ شیخ میں آئی اور کہا "اے امام اہلِ اسلام

میرا جواں ہمت بیٹا ایک روز تیری مجلس میں آیا اور دیوانہ ہو کر گیا۔ اب میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے؟ اس عورت کی حالتِ زار پر شیخ کا دِل پسیجا۔ کہا "غم نہ کھا، تیرا بیٹا ملا، تو تجھے ضرور اطلاع دوں گا۔ ایک رات شیخ احمد، خدمتِ شیخ میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا۔ جاؤ اس کی ماں کو بُلا لاؤ۔ جب اس کی ماں اس کے اہل و عیال کے ساتھ آئی، تو سب نے شیخ احمد کو دیکھ کر نالہ و فریاد شروع کر دیا۔ ہر چند کہا کہ شیخ احمد ان کے ساتھ گھر چلے، مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ بلکہ شیخ سے کہا آپ نے ان لوگوں کو بلا کر میرا وقت خراب کیا۔ یہ تو میرے لئے وبالِ جان بن گئے ہیں۔" اس پر اس کی بیوی بولی۔ تو نے اپنا بنا بنایا کام خراب کر دیا ہے۔ مجھ پہ جو بیتے گی، اس کو خوش و ناخوش اپنے سر پر لوں گی۔ اس اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لیتا جا۔" احمد نے کہا: "بہت خوب! اسی وقت لڑکے کا لباس اتروا کر گدڑی پہنا دی اور ہاتھ میں زنبیل دے دی۔ لڑکے کی ماں نے جو یہ صُورت دیکھی، تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی اور شیخ احمد نے اپنی راہِ دشت لی۔" (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۳۳)

یہ سری سقطی (م ۲۵۰ھ) تیسری صدی کے صوفی ہیں۔ جب کہ ابھی تصوف کی کُتب تصنیف بھی نہ ہوئیں تھیں۔ گویا اسی دور سے ان صوفیاء کا طور طریق شریعتِ اسلامیہ سے الگ ہو گیا تھا۔

بُوعلی فارمدی (م ۴۷۷ھ) اور امام قشیری

"آپ نے (امام قشیری نے) مجھے (بُوعلی فارمدی کو) فرمایا" اے نوجوان جاؤ۔ تحصیلِ علم کرو۔ میں مزید تین سال تک تحصیلِ علم میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں نے جب دوات سے قلم نکالا، تو وہ سیاہ کے بجائے سفید نکلا۔ میں نے حضرت امام ابوقاسم قشیری کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ سنایا، تو آپ نے فرمایا" اس بات کا مطلب یہ ہے کہ علم تجھ سے دستبردار ہو گیا تو تو بھی اب علم سے دست بردار ہو جا اور طریقت کا راستہ اختیار کر لے اور اس میں مشغول ہو جا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۲۴)

امام قشیری کی اس تعبیر واقعہ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ طریقت کا علم شریعت کے علم سے افضل ہوتا ہے۔ کیونکہ شریعت کا علم سیاہی سے لکھا جاتا ہے اور سیاہ ہوتا ہے۔ جب کہ طریقت کا علم سفید ہوتا ہے۔ البتہ یہ سمجھ نہیں آئی کہ دوات سے قلم سفید کیسے نکلا؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ قلم کو سیاہی نہ لگے اور خشک ہی باہر نکل آئے۔ لیکن وہ سفید کیسے ہو گیا تھا؟ یہ راز صوفیاء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

۲۔ شیخ کی غیر مشروط اطاعت کی پابندی

مُرید کو شریعتِ اسلامیہ سے برگشتہ کرنے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ صوفی لوگ (یا دینِ طریقت کے دوسرے مذہبوں کے گرو) اپنے نئے مُرید سے سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کا عہد لیتے ہیں اور اگر کہیں کوئی درمیان میں اللہ و رسول ﷺ کے احکام کا ذکر کر دے تو وہ راندۂ درگاہ قرار دیا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی اس مفہوم کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا فرما رہے ہیں۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا!

ترجمہ: اگر تجھے بزرگ پیر اپنے مصلّٰی کو شراب میں رنگین کرنے کا حکم دے، تو ضرور ایسا کر کہ سالک (سلوک کی) منزلوں کے آداب و مراسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔

تصوّف، سلوک اور اطاعتِ شیخ

اطاعتِ شیخ کے متعلق مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں کہ:

"تصوف اور تزکیۂ باطن میں سالک اور شیخ کا تعلق بڑا نازک ہے۔ ظاہری علوم میں معاملہ اور قسم کا ہے۔ استاد سے نفرت اور اس کی مخالفت کے باوجود آدمی ظاہری علم حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اس راہ میں شیخِ کامل میسر آجائے، تو اس کی مخالفت مانعِ فیض ہی نہیں، بلکہ حرام ہے۔ شیخِ کامل کی مخالفت دراصل تزکیۂ باطن اور رضائے الٰہی کے حصول سے نافرمیدہ ہونے کی دلیل ہے۔" (دلائل السلوک ص ۱۵۱)

اب دیکھئے اقتباسِ بالا میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں:

۱۔ معصوم اور مبرّا عن الخطاء صرف انبیاء کرام کی ذات ہوتی ہے۔ شیخ خواہ کامل سے کامل تر کیوں نہ ہو۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق وہ معصوم اور مُبرّا عن الخطا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایسی غیر مشروط اطاعت قرآن کریم کی رُو سے صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے۔ باقی سب سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور مخالفت بھی۔ جیسا کہ حضرت امام مالکؒ نے آپ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے واضح طور پر کہا: "کہ اس صاحبِ قبر کے سوا ہر کسی کی بات کو قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رَد بھی، مگر آپ کی کسی بات کو رَد نہیں کیا جا سکتا۔"

۲۔ یہ شیخ کامل حضرات جس طرح سے سالکین کی تربیت فرماتے ہیں اس کی مثالیں ہم کسی دوسرے مقام پر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بے شمار باتیں صریحاً خلافِ شریعت ہوتی ہیں۔ اب اگر ان کی مخالفت کو کو حرام قرار دیا جائے، تو بتلایئے شخصیت پرستی اور کسے کہتے ہیں؟ یہی بات تصوّرِ شیخ کا پہلا زینہ

ہے جسے آپ خود بھی حرام فرماتے ہیں۔

۳۔ آپ نے حصولِ علم وفیض کی منطق بیان فرماتے ہوئے افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ استاد سے اگر نفرت اور مخالفت ہو تو ظاہری علوم میں بھی کسبِ علم وفیض مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ بھلا جو شاگرد اپنے استاد سے تنفر ہے اور مخالف بھی ہے وہ اس کے پاس کیا لینے جائے گا اور جائے گا بھی، تو استاد اسے جس شفقت سے کچھ بتلائے گا، وہ سب کو معلوم ہے۔

۴۔ چونکہ آپ نے شیخ کامل کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے۔ یہی اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ایسے علم وفن کا اکتساب، جس میں اللہ اور رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی غیر مشروط اطاعت کو لازمی قرار دیا جائے، از روئے شریعت حرام ہے۔

صادق فرغانی کی زائد شرط

حدائق الاخبار کے مترجم اس غیر مشروط اطاعت کے علاوہ کچھ نذر و نیاز کی بھی ہدایت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب سالک مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے چکے، تو اسے چاہیئے کہ اس کے آگے بے اختیار ہو جائے، جیسے مردہ غسال کے سامنے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ یعنی اسے کسی بات کا اختیار نہ رہے اور جب کبھی اپنے پیر کی خدمت میں جائے خالی ہاتھ نہ جائے اگرچہ تھوڑی چیز دے مگر دے ضرور، کیونکہ یہ اس کی محبت اور اخلاص کی علامت ہے۔" (تلقین مرشدِ کامل، ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۱۴۰، مطبوعہ شیخ محمد بشیر اردو بازار، لاہور)

اس غیر مشروط اطاعت کا اثر سالک یا مرید پر جو ہو سکتا ہے، وہ تو فرغانی صاحب نے بتلا دیا ہے۔ کہ مرید، پیر کے ہاتھوں میں یوں بے بس و بے اختیار ہونا چاہیئے، جیسے غسال کے ہاتھوں میں مردہ۔ اور مرشدانِ کامل پر یہ اثر ہوا کہ وہ پہلے ہی اپنے آپ کو نبی یا رسول سے کم تر نہ سمجھتے تھے۔ اب اپنا کلمہ بھی پڑھوانے لگے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

اللہ کے نئے نئے رسول

خواجہ فریدالدین گنج شکر فرماتے ہیں:

"کیونکہ پیر کے کام میں مستعد ہونا عین دین کے کاموں میں

مُستند ہوتا ہے۔ پھر فرمانے لگے، ایک مرتبہ میں شیخ معین الدین (اپنے دادا پیر مؤلف) کی خدمت میں حاضر تھا اور اہلِ صُفّہ بھی موجود تھے۔ اولیاء اللہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور بیعت کے لئے پابوسی کی۔ آپ نے اس کو بٹھالیا۔ اُس نے عرض کی میں مُرید ہونے آیا ہوں۔ فرمایا، جو کچھ ہم کہیں گے کرے گا۔ اگر یہ شرط منظور ہے، تو بیشک میں مرید کرلوں گا۔ اس نے کہا جو کچھ آپ کہیں گے وہی کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تو اس طرح کلمہ پڑھتا ہے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمد رسُول اللہ" ایک بار اس طرح پڑھ "لَا الٰہ الّا اللہ چشتی رسُول اللہ"۔ چونکہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے فوراً پڑھ لیا۔ خواجہ نے بیعت لی اور بہت کچھ خلعت و نعمت عطا کی اور فرمایا میں نے فقط تیرا امتحان لیا تھا کہ تجھ کو مجھ سے کس قدر عقیدت ہے۔ ورنہ میرا مقصود نہ تھا کہ تجھ سے اس طرح کلمہ پڑھواؤں۔" (فوائد السالکین ملفوظات قطب الدین بختیار کاکی۔ مرتبہ فریدالدین گنج شکر، ترجمہ غلام احمد بریان۔ ص ۱۲۶، ۱۲۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے پیر کا مقام، منصبِ رسالت تو یہ تھا کہ جب رسول ﷺ بلائیں مومنوں کو فوراً آنا چاہیئے اور رسول کی اطاعت بھی اتنی غیر مشروط نہیں کہ دنیوی کاموں میں بھی آپ کی اطاعت لازم ہو جیساکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی بار آپؐ سے پوچھ لیا کہ یہ آپ کی رائے ہے یا حکم۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میری رائے ہے، تو صحابہؓ نے اختلاف کیا۔ لیکن یہاں غیر مشروط اطاعت اور پیر کے کاموں میں مشغول رہنے کو عین عبادت قرار دیا جاتا ہے۔

پھر اگر پیر صاحب نے اس نئے مرید کی اطاعت و عقیدت کا ٹیسٹ لینا ہی تھا تو یہ تو کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا تھا۔ کیا اس ٹیسٹ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اسلام کے بنیادی کلمۂ شہادت پر ہی یہ وار چلایا جائے اور مُرید کے راسخ العقیدہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ ایسا کلمۂ کفر کہہ دے۔ یہ تو وہی بات ہوتی، جو بابل میں ہاروت، ماروت جادو سکھلانے سے پیشتر کہہ لیا کرتے تھے کہ یہ کُفر اختیار نہ کر۔ پھر بھی اگر کوئی راسخ العقیدہ ہوتا اور کلمۂ کُفر پڑھ لیتا، تو اسے جادو سکھا دیتے اور یہ سب اللہ کی طرف سے آزمائش اور فتنہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اِن پیروں میں ایسا کلمہ پڑھانا اور آزمائش لینا ایک پرانا دستور ہے۔ کیونکہ شیخ شبلی نے بھی ایک شخص سے ایسا ہی ٹیسٹ لیا تھا۔ (فوائد الفواد۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء۔ مرتبہ خواجہ حسن دہلوی۔ ترجمہ پروفیسر محمد سرور علما اکیڈمی اوقاف، پنجاب، لاہور)

ان واقعات کی تصدیق حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ صاحب نے بھی فرمادی ہے۔ وہ اپنی کتاب التکشف میں لکھتے ہیں کہ تھانہ بھون کے پیر صادق صاحب کلمہ لا الہ الا اللہ صادق رسول اللہ کو آزمائش کے طور پر استعمال کرتے تھے اور پھر چشتی رسول اللہ اور شبلی رسول اللہ کی طرح اس کے بعد معذرت بھی نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ کلمہ بالکل صحیح تھا کیونکہ ان کے خیال میں صادق رسول اللہ یا رسول اللہ صادقؐ ایک ہی بات تھی۔

علاوہ ازیں مولانا موصوف اس کلمہ کے معاملہ میں اپنی ذات کے لئے خاصی لچک رکھتے تھے مولانا محمد سعید اکبر آبادی، جو دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اپنے رسالہ 'برہان' فروری ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۱۰۷ پر رقمطراز ہیں کہ:

"اپنے معاملات میں تاویل و توجیہہ اور اغماض و مسامحت کی مولانا میں جو خُو تھی اُس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے ان کو لکھا کہ رات خواب میں مَیں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہر چند کلمۂ شہادت صحیح صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ لا اِلٰہ الا اللہ کے بعد اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے۔"

"ظاہر ہے کہ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ یہ کلمۂ کفر ہے۔ شیطان کا فریب اور نفس کا دھوکہ ہے۔ تم فوراً توبہ استغفار کرو۔ لیکن مولانا تھانوی صاحب صرف یہ کہہ کر بات آئی گئی کر دیتے ہیں کہ تم کو مجھ سے غایت محبت ہے۔ یہ سب کچھ اسی کا ثمرہ ہے۔" (برہان، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۷)

۳۔ غیر شرعی احکام کی تلقین

اسلام جس چیز کو توحید قرار دیتا ہے وہ صوفیاء کی نظروں میں شرک ہے اور جس چیز کو شرک قرار دیتا ہے۔ وہی دینِ طریقت کی بنیاد ہے۔ عموماً صوفیاء کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ باطنی علم تقویٰ شریعتِ اسلامیہ کی پابندی، تسبیح و تحمید اور اصلاحِ نفس سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ محض ایک فریب ہے حقیقت یہ ہے کہ باطنی علم بھی جادو ہی کی طرح کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ جس طرح ہاروت اور ماروت لوگوں کو کہتے تھے کہ اگر کفر و شرک کی باتیں منظور ہیں، تو تم جادو کا علم سیکھ سکتے ہو ورنہ اس کام کے نزدیک نہ جاؤ۔ بعینہٖ یہی صورت اس دینِ تصوف میں ہے۔ چنانچہ امام غزالی احیاء العلوم (ج ۴، ص ۳۵۸) پر ایک حکایت نقل کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا طریقِ تربیت

ایک شخص تیس سال ابویزید بسطامی کی خدمت کرتا رہا

ایک روز اس نے شکایت کی یا حضرت! میں تیس[۳۰] سال آپ کی خدمت میں رہا۔ رات کبھی نہیں سویا اور ہمیشہ روزے بھی رکھتا ہوں۔ مگر میرے دل میں باطنی علم کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ میں اس کا قائل بھی ہوں۔ ابویزید نے کہا تم تین سو سال بھی لگے رہو، تو یہ علم حاصل نہ کر سکو گے۔ مُرید نے پوچھا، اس کا کوئی علاج؟ بایزید نے فرمایا، تم وہ علاج کر نہ سکو گے۔ مرید نے جب اصرار کیا، تو فرمایا: "اپنی داڑھی اور سر منڈوا دو، گدڑی پہن لو۔ باداموں کا ایک کشکول اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے گرد بچوں کو جمع کرو اور کہو جو بچہ مجھے ایک گھونسا مارے گا، اُسے ایک بادام دوں گا۔ اسی طرح گلی گلی پھرو۔" مُرید نے کہا: "سبحان اللہ! یہ کیا علاج ہے؟" بایزید نے کہا، "تیرا سبحان اللہ کہنا بھی شرک۔ کیونکہ یہ کلمہ تُو اپنی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔" مُرید نے کہا: "مجھ سے یہ علاج تو نہیں ہو سکتا کوئی اور بات تبلایئے۔" بایزید نے کہا: "اگر یہ علاج نہیں کر سکتا، تو دوسرا کوئی علاج نہیں۔ (احیاء العلوم، ج ۴، ص ۳۵۰)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد امام غزالیؒ لکھتے ہیں: "جس شخص کا دل بیمار ہے اور وہ اپنے نفس کے تابع ہے اس کا علاج وہی ہے جو بایزید نے تجویز کیا۔"

ان واقعات سے آپ اس باطنی علم کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں کہ کس انداز میں مرید کو علانیہ خلافِ شریعت کاموں اور اپنی غیر مشروط اطاعت اور شرکیہ عقائد کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، تو بس شیطانی تجلیات، قلبی واردات، ہاتفِ غیبی کی آواز دل اور مشاہدات و مکالماتِ حق تعالٰے کے لئے دروازے کھلتے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس مرید بیچارے نے تین خلاف شریعت کام، تو پہلے ہی سرانجام دے لئے تھے۔ (۱) رات کو بالکل نہ سونا۔ (۲) ہمیشہ روزہ رکھنا۔ (۳) دینِ طریقت پر ایمان۔ اب چوتھی بات پیر کی غیر مشروط اطاعت میں فیل ہونے کے باعث نامراد ہی رہا۔

۴۔ قرآن و سنت سے دُور کرنا

اور اس کے کئی طریقے ہیں مثلاً:

۱۔ رات کو قرآن پڑھنے سے منع کرنا۔

عبدالوہاب شعرانی اپنی کتاب کبریتِ احمر بر حاشیہ الیواقیت والجواہر کے صفحہ ۱۲ پر لکھتا ہے کہ:

"اللہ تعالٰی نے ندائے غیب کے ذریعہ فرمایا: "اے بندو! رات میرے لئے ہے نہ اس لئے کہ اس میں

قرآن پڑھا جائے۔ تیرے لئے دن میں بہت کام ہوتے ہیں۔ میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ جب تو رات کو قرآن پڑھے گا، تو اُس کے معانی تجھے مشاہدہ سے تفرقہ کی طرف لے جائیں گے۔ پھر کوئی آیت تجھے میری جنت، اور جو کچھ میں نے اس میں پیدا کیا ہے، کی طرف لے جائے گی۔ تو پھر جب تو اپنی جنت میں حوروں کے ساتھ استبرق کے بچھونوں سے تکیہ لگائے ہوگا، تو میرا خیال کہاں ہوگا؟ پھر کوئی آیت جہنم کی طرف تجھے لے جائے گی اور اس میں طرح طرح کے عذاب کا معائنہ کرے گا۔ تو جب تو ان باتوں میں مشغول ہوگا، تو میرا خیال کب ہوگا؟ پھر کوئی آیت تجھے قصہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام صالح علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لے جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ میں نے تجھے تدبر کا حکم نہیں دیا، بلکہ یہ کہ تو اپنے دل کے خیالات کو مجھ پر مجتمع کرے۔ رہیں استنباط احکام والی آیات تو ان کے لئے دوسرا وقت ہے۔" (فضائح صوفیاء، ص ۸)

اب دیکھئے شعرانی صاحب کس خطرناک انداز سے مسلمانوں کی توجہ قرآن کی تلاوت سے ہٹا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمائیں کہ:

۱۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۲۴/۴۷)	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ یا ان کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔
۲۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰/۴۵)	پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو شخص ہمارے (عذاب کی) وعید سے ڈرتا ہے ان کو قرآن سے نصیحت کرتے رہو۔
۳۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۷۳/۱-۴)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو کپڑے میں لپٹ رہے ہو۔ رات کو قیام کرو مگر تھوڑی سی رات، نصف یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔

لیکن یہ حضرت توجہ الی اللہ کی آڑ میں رات کو قرآن پڑھنے اور اس میں غور و تدبر کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔

ب۔ اپنے بنائے ہوئے اوراد و وظائف اور اعمال کو قرآن سے بہتر قرار دینا۔

اور عام مشاہدہ ہے کہ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے حضرات اوراد و وظائف، درود لکھی، درود تاج، قصیدہ غوثیہ، شش قفل، ہفت ہیکل وغیرہ وغیرہ کی تلاوت ضرور کرتے ہیں۔ قرآن خواہ پڑھیں یا نہ

پڑھیں۔ اسی طرح انہوں نے کئی طرح کی نمازیں بھی ایجاد کر رکھی ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ فاتح، صلوٰۃ غوثیہ، خضر کی نماز وغیرہ وغیرہ۔ اور احمد تیجانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "صلوٰۃ الفاتح کا ثواب، جو کچھ زمین بھر میں ذکر اذکار پڑھے جاتے ہیں ان کو چھ ہزار سے ضرب دی جائے، تو اس کے برابر ہے۔" (فضائح صوفیاء، ص ۱۰)

ج قرآن سے دُور رکھنے کا تیسرا طریق یہ ہے کہ انہوں نے قرآن اور اسی طرح حدیث کو بھی اسرار و رموز کا مجموعہ قرار دے دیا ہے۔ پہلے الفاظ کے ظاہری اور باطنی معانی کی تفریق پیدا کی۔ پھر باطنی معانی کو ظاہری پر ترجیح دے کر یوں گویا ہوئے۔

خُضْتُ بَحرًا وَ وَقَفَ الْاَنبِيَاءُ بِسَاحِلِهِ ہم تو سمندر میں کود گئے اور انبیاء ساحل پر ہی کھڑے رہے۔

یعنی انبیاء ظاہری معانی پر ہی لگے رہ گئے۔ جب کہ ہم لوگ ان کے باطنی معانی تک پہنچ گئے۔

اور ابن سبعین نے تو کتاب و سنت کی مخالفت میں یہاں تک کہہ دیا:

لَقَدْ حَجَرَ ابْنُ آمِنَةَ وَاسِعًا اِذْ ابن آمنہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) نے اللہ کی وسیع رحمت

قَالَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (فضائح صوفیاء، ص ۱۰) کو یہ کہہ کر مقید کر دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

ابن سبعین کو یہ خرافات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ حضرات نہ تو اپنے آپ کو انبیاء سے کمتر سمجھتے ہیں اور نہ اپنے مکشوفات و مشاہدات کو شریعت سے کمتر سمجھتے ہیں اور اس کی تفصیل آپ کو مناسب مقامات پر اس کتاب میں مل جائے گی۔

امام ابن قیم نے مدارج السالکین (جو اسمٰعیل ہروی (م ۴۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح اور اس پر تبصرہ ہے) میں سلوک کے مقامات پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے، جو ارباب تصوف پیش کرتے ہیں، تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس مقام کو صحابہ، بلکہ انبیاء بھی حاصل نہ کر سکے۔" (تزکیۂ نفس، ص ۲۰۷)

"ابو اسمٰعیل ہروی (م ۴۸۱ھ) نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ وغیرہ کی شرح میں تین درجے مقرر کئے ہیں۔ پہلا درجہ عوام کا، دوسرا خواص کا، تیسرا اخص الخواص کا۔ پہلے درجہ کا معیار ہی وہ اتنا اونچا بیان کرتا ہے۔ جتنا کہ قرآن کسی کو لے جانا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی کسر رہ جائے، تو وہ دوسرے میں بہرحال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف مافوق البشریت درجہ معلوم ہوتا ہے اور شیخ کے نزدیک یہی درجہ کاملین کا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کتاب و سنت کو معیار بنا کر اس کا تجزیہ کرے، تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ

اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے، تو وہ شیخ کے ذہن میں ہے۔ کتاب وسنت سے ثبوت تو کیا اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔" (حوالہ ایضاً)

۶۔ صُوفیاء کا باطنی سیاسی نظام

باطنی نظام کے قیام کی ضرورت

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم زمین کی حکومت اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتے ہیں۔ جب صوفیاء نے، جو خود کو صالحین کا جانشین تصور کرتے ہیں، دیکھا کہ ان کے پاس تو صرف عزلت اور گوشہ نشینی یا غیب دانی اور تصرفات ہی رہ گئے ہیں۔ رہی زمین کی حکومت یا سلطنت، تو اس سے ان کا کسی دَور میں کوئی واسطہ نہیں رہا، تو اس مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ ایک تو دنیوی سلطنت کی بھرپور تنقیص کی جائے۔ دوسرے اپنا الگ باطنی نظام قائم کر کے اس کو ظاہری حکومت سے برتر ثابت کیا جائے۔ تو جس طرح شیعہ حضرات نے اپنا الگ باطنی نظام قائم کر کے اس نظام کا پیشوا امام معصوم کو قرار دیا۔ اسی طرح صوفیاء نے اپنا الگ باطنی نظام قائم کیا جس کا پیشوا "غوث" کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

باطنی نظام کا صدر دفتر اور عہدیداروں کے مساکن

باطنی مناصب، ان کی تعداد اور طریق کار کے سلسلہ میں عبدالرحمٰن عبدالخالق مصنف "فضائح الصوفیاء" کی تحقیق یہ ہے کہ "تمام عالم میں 'غوث' ایک ہوتا ہے۔ جس کے ماتحت چار 'قطب' ہوتے ہیں اور عالم کے چاروں کونوں پر 'غوث' کے حکم سے مامور ہوتے ہیں پھر سات 'ابدال' ہیں، جو 'غوث' کے حکم سے سات پہاڑیوں پر رہتے ہیں۔ پھر ان کے بعد 'نجیب' کا کا درجہ ہے اور یہ ہر شہر میں ایک ایک ہوتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے ساری دنیا پر اپنا جال بچھا رکھا ہے اور ان کا دفتر 'غارِ حرا' میں ہے۔ جہاں یہ سب حضرات ہر رات کو اکٹھے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی قدر و قضا پر نظر رکھتے ہیں۔" (فضائح الصوفیاء عبدالرحمٰن عبدالخالق، ص ۴۵، مطبوعہ کویت)

اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں اولیائے کے ان باطنی مناصب اور فیوض

کی تفصیل ایک ذیلی عنوان "طبقات رجال الغیب" کے تحت کچھ اس طرح دی گئی ہے:

طبقاتِ رجالُ الغیب صوفیاء کے نزدیک دنیا اس لئے قائم ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستور مگر منظّم سلسلے کی شفاعت سے اس کی بلائیں ٹلتی رہتی ہیں۔ دنیا میں اِن اولیاء اللہ کی تعداد مقرر ہے۔ جب ایک ولی کا انتقال ہوجاتا ہے، تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس کی تعداد تین سو نقباء، چالیس اَبدال، سات امناء، چار عمود اور اُن کا قطب شامل ہیں۔ (قطب یعنی وہ محور، جس کے گرد بخیال صوفیاء سارا نظام گردش کرتا ہے یغوث)

(دائرہ مج ۶، ص ۴۲۶، زیرِ عنوان تصوف)

مناصبِ اولیاؔاللہ کی شرعی بنیادیں

مندرجہ بالا سرسری معلومات کے بعد اب ہم آپ کو اللہ یار خان صاحب کی تفصیلی معلومات سے متعارف کرائیں گے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب 'دلائل السلوک' میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ سب اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں آپ نے چودہ احادیث ابونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) کی کتاب حلیۃ الاولیاء سے درج فرمائی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق بھی ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ اس دس جلدوں پر مشتمل مبسوط کتاب میں رطب و یابس سب کچھ شامل ہے۔ موضوع احادیث کی بھرمار ہے اور بہ تکلف خلفائے اربعہ اور بعض دوسرے صحابہ کو بھی اس زمرۂ صوفیاء میں شامل کرلیا گیا ہے اب مولانا موصوف اس کتاب سے چودہ احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"مذکورہ بالا احادیث کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے۔" (د۔س، ص ۶۸) پھر اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ، جو خود اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں) کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ اور وہ تحقیق یہ ہے کہ:

"علامہ سیوطی نے قریباً بیس کتب و رواۃ سے ابدال کی احادیث نقل کی ہیں اور تمام کو صحیح اور حسن فرمایا ہے۔ تمام طرقِ احادیث کو جمع کرنے پر قدرِ مشترک یعنی ابدال کا وجود یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا جس مستقل کتاب کا حوالہ علامہ موصوف نے دیا ہے اس کا نام" الخبر الدال علیٰ وجود القطب والنجباء والابدال" ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۶۹)

اب دیکھئے کہ اس اقتباس میں :

۱۔ مولانا اللہ یار خان نے تسلیم کر لیا ہے کہ ان تمام احادیث کے رواۃ مجروح ہیں۔

۲۔ علامہ جلال الدین سیوطی بیس ۲۰ احادیث نقل کر کے فرما رہے ہے کہ احادیث صحیح بھی ہیں اور حسن بھی۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحاح ستہ میں مذکور نہیں۔ لہٰذا یہ حسن اور صحیح کا دعوے محلِ نظر ٹھہرا۔

۳۔ جس مستقل کتاب "الخبر الدال علی وجود القطب والنجبأ والابدال" سے علامہ سیوطی نے یہ بیس (۲۰) احادیث نقل فرمائیں، وہ خیر سے اُن کی اپنی تصنیف ہے۔ (دلائل السلوک، ص ۲۱۵)

۴۔ ان تمام احادیث میں چونکہ قدر مشترک " ابدال " کا لفظ ہے، لہٰذا سفارش کی گئی ہے کہ کم از کم اس ابدال کو تو ضرور تسلیم کر لیا جائے۔

گویا ایسی معتبر احادیث سے مناصب اولیاء اللہ ثابت ہو گئے۔ اب جن اُمور پر ان احادیث سے مزید روشنی پڑتی ہے، وہ درج ذیل ہیں :

احادیث متعلقہ قطب ابدال وغیرہ

حدیث (۱) کے مطابق ۵۰۰ اخیار اور ۴۰ ابدال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ابدال مَر جائے، تو ان ۵۰۰ میں سے کوئی ایک ترقی کر کے ڈیفِنی پُر کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا "خیر" آجاتا ہے۔

حدیث ۲ ___ احمد کی حدیث ہے، اس میں ابدال کی تعداد ۳۰ ہے۔ ان کے قلوب ابراہیم خلیل اللہ کے قلب پر ہیں۔

حدیث ۳ ___ طبرانی کی حدیث ہے۔ اس میں ابدال ۳۰ ہیں اور ان کی برکات یہ ہیں کہ (۱) ان کے دم قدم سے زمین قائم اور (۲) بارش ہوتی ہے۔

حدیث ۴ ___ ابنِ عساکر کی حدیث ہے۔ اس میں ابدال ۴۰ ہیں، مگر ہیں سب علاقہ شام کے۔ اُن کی برکت سے (۱) بارش ہوتی ہے۔ (۲) دشمن پر فتح ہوتی ہے۔ (۳) اہلِ زمین سے تکالیف اور مصائب دُور کئے جاتے ہیں۔

حدیث ۵ ___ (طبرانی) اس حدیث میں ابدال کی تعداد مذکور نہیں، البتہ علاقہ شام مذکور ہے ان کی برکت سے (۱) تمہیں مدد دی جاتی ہے۔ (۲) رزق ملتا ہے۔

حدیث ۶ ــــ (احمد) یہ ابدال علاقہ شام کے ۴۰ مرد ہیں۔ ان کی تعداد پوری کر دی جاتی ہے۔ ان کی برکت سے (۱) بارش ہوتی ہے۔ (۲) دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دی جاتی ہے اور (۳) صرف شام کے علاقہ کو عذاب سے دُور کیا جاتا ہے۔

(معلوم ہوتا ہے کہ آجکل یا تو شام میں ابدال نہیں رہے یا پھر اُن کی برکات ختم ہو چکی ہیں کہ مسلمان وہاں محکوم و مقہور ہیں اور یہودیوں کے ہاتھوں عذابِ شدید بھی اٹھا رہے ہیں)

حدیث ۷ ــــ خلال کی حدیث میں ابدال تو ۴۰ ہیں مگر ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ مجموعی تعداد ۴۰ ہے۔ الگ الگ تعداد مذکور نہیں۔

حدیث ۸ ــــ (حاکم) ابدال موالی میں سے ہیں (یعنی یہ ابدال عربی النسل نہیں ہوتے۔ یا تو اُن کے غلام ہوتے ہیں یا اُن کے ہاتھ پر اسلام لانے پر اُن کے قبیلہ سے منسلک ہو جاتے ہیں۔)

حدیث ۹ ــــ (ابن ابی الدنیا) ابدالوں کی علامت یہ ہے کہ وہ کسی پر لعن طعن نہیں کرتے (اب بتلائیے کہ اس ایک نشانی سے آپ کسی ابدال کی شناخت کر سکتے ہیں؟)

حدیث ۱۰ ــــ (ابنِ حبان) ابراہیم خلیل جیسے تیس[۳۰] اور اسی[۸۰] سے زمین خالی نہ رہے گی۔ اِن کی برکات یہ ہیں۔ (۱) فریاد رسی ہوگی (۲) رزق دیا جائے گا۔ (۳) بارش ہوگی۔ (اس تیس اور اسی کی تعداد کی ہمیں تو سمجھ نہیں آئی۔ ممکن ہے آپ کچھ سمجھ کر اس حدیث صحیح اور حسن سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکیں)

حدیث ۱۱ ــــ (بیہقی) اس حدیث میں نہ تعداد ہے نہ علاقہ کا تعین ہے نہ برکات کا۔ مذکور یہ ہے کہ میری اُمت کے ابدال اپنے عملوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ کی رحمت، نفسوں کی سخاوت اور سینوں کی سلامتی کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

حدیث ۱۲ ــــ (ابنِ عدی) ابدال چالیس ہیں۔ ۲۲ شام میں اور ۱۸ عراق میں اور ان کی علاقہ وار تعداد پوری رکھی جاتی ہے۔

حدیث ۱۳ ــــ (طبرانی) طبرانی کی حدیث ۳ میں ابدال ۳۰ تھے۔ اس حدیث ۱۳ میں ۴۰ ہیں اور ان کی برکات مذکورۃ الصدر ہی ہیں۔

حدیث ۱۴ ــــ (حدیث ابو نعیم سب مندرجہ بالا احادیث کے بلا مکمل حوالہ راوی ہیں) ابدال ۴۰ مرد ہیں اور برکات یہ ہیں کہ اہلِ زمین کی تکالیف دُور ہوتی ہیں۔ سو یہ ہے وہ سرمایۂ احادیث جن کے

ذریعہ مناصب اولیاء کو مشروع ثابت کیا جا رہا ہے۔ سچ کہا تھا علامہ سیوطی نے کہ ان سب روایات میں صرف ایک لفظ "ابدال" بطور قدر مشترک آتا ہے۔ نہ ان کی تعداد پر اتفاق نہ جنس پر نہ علاقہ پر نہ مناصب پر، ان احادیث سے البتہ اس طبقہ صوفیاء کے معیارِ صحت کا ضرور پتہ چل جاتا ہے۔

ان میں قطب کے بارے میں کوئی حدیث مذکور نہیں۔ چنانچہ اللہ یار خان لکھتے ہیں کہ:

"اور قطب کے متعلق جو بیان ہوا۔ جیسا کہ بعض محدثین نے لکھا ہے۔ ابُونعیم نے حلیہ میں بیان کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں اس کی تائید میں وارد ہو چکی ہیں۔ جن کا ذکر ہو چکا (وہ غالباً درج بالا ہی ہیں) اور وہ بھی جو مذکور نہیں۔ مثلاً حکیم ترمذی (م ۲۸۵ ھ مصنف کتاب ختم الولایۃ) اور ابُونعیم کہ ہر زمانہ میں میری امت میں سابقون ہوں گے اور ہر زمانہ کے لئے سابقون ہوں گے۔" (دلائل السلوک، ص ۶۸، بحوالہ فتاوی الحدیثیۃ، ص ۲؛ ۲۷۷، لابن حجر مکی، م ۹۷۵ھ)

گویا جس شخص کو حکیم ترمذی اور ابونعیم، سابق سے تعبیر کرتے ہیں وہی شخص ابنِ حجر مکیؒ کے نزدیک قطب ہے لہٰذا قطب کا منصب بھی احادیث سے ثابت ہو گیا۔

رہے دوسرے مناصب مثلاً ابرار، اوتاد، نجیب، نقیب، اعماد، غوث وغیرہ، تو اُن کے متعلق مولانا اللہ یار خان صاحب فرماتے ہیں:

"صوفیاء کی بعض اصطلاحات کی اصل تو خود قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ جیسے ابرار، اخیار، نقباء، علامہ سیوطی نے ان اصطلاحات پر ایک مستقل رسالہ (وہی رسالہ 'الخبر الدال علیٰ وجود القطب والنجباء والابدال' جس کا ذکر پہلے سے چل رہا ہے) بھی لکھا ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۷۰)

بات یہ ہے کہ قرآن میں فی الواقع ابرار، اخیار، اور نقباء کے الفاظ ضرور موجود ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ الفاظ صوفیاء کے انہی اصطلاحی معنوں اور مناصب کے لئے استعمال کئے گئے ہیں؟ اب اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی میں ہے، تو آخر یہ صوفیاء اس طرح کی فریب دہی کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ مثلاً قرآن کی رُو سے انبیاء سب کے سب اخیار ہیں۔ اب صوفیاء کے عقیدہ کی رُو سے ہر وقت ۷، اخیار موجود رہتے ہیں۔ ان کے اوپر ۴ قطب اور ایک غوث ہوتا ہے اور نیچے ۷۰ نجیب اور ۳۰۰ نقیب، تو کیا یہ انبیاء اسی طرح کے اخیار کے مناصب پر فائز تھے؟

نیز قرآن میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے ۱۲ قبیلوں کے ۱۲ نقیب (سردار چودھری ٹائپ کے صوفی

ٹائپ) مقرر کر دیئے، تو کیا یہ سردار ایسے ہی نقیب تھے، جو صوفیاء کو درکار ہیں؟
اس کے بعد سیوطی صاحب نے صوفیاء کے اِن مناصب کے ثبوت میں جو دو احادیث بیان فرمائیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "خدا کے ۳۰۰ بندے مخلوق ہیں جن کے قلوب حضرت آدم علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ ۴۰ کے قلوب حضرت موسےٰ علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ ۷ کے قلوب حضرت ابراھیم علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ ۵ کے قلوب حضرت جبرائیل کے قلب کی مانند ہیں۔ ۳ کے قلب حضرت میکائیل علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔ اور ایک ایسا بندہ ہے جس کا قلب حضرت اسرافیل علیہ السلام کے قلب کی مانند ہے۔"

۲۔ خطیب نے بذریعہ ابوبکر ابن ابی شیبہ حدیث کا اخراج کیا کہ میں نے کنانی سے سنا کہ "نقبأ ۳۰۰ ہیں۔ نجبأ ۷۰ ہیں، ابدال ۴۰ ہیں، اخیار ۷، قطب ۴، اور غوث ایک ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۱۷)

ان دونوں احادیث کے تقابل سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ کے مناصب کی تعداد ۶ ہے۔ سب سے اعلیٰ منصب غوث کا ہے، جس کا دل حضرت اسرافیل علیہ السلام کے قلب کی مانند ہے۔

۲۔ سب سے نچلا منصب نقیب کا ہے۔ یہ کُل ۳۰۰ سیٹیں ہیں اور اُن کا دِل حضرت آدم علیہ السلام کے قلب کی مانند ہوتا ہے۔

۳۔ باقی چار مناصب کی نشستوں میں اختلاف ہے اور اسی طرح اس بات میں بھی کہ ان کے قلوب کس علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔

۴۔ انبیأ کے قلوب سے ملائکہ کے قلوب بہت افضل ہوتے ہیں۔ سب سے کم تر درجہ کا قلب نقیب یا حضرت آدم علیہ السلام (نعوذ باللہ من ذلک الھفوات) کا دِل ہے۔ پھر اس کے اوپر حضرت موسےٰ علیہ السلام پھر اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کی باری آتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اوپر حضرت جبرائیل علیہ السلام کا دل ہے۔ پھر اس کے اوپر حضرت میکائیل علیہ السلام کا، پھر اس سے اوپر حضرت اسرافیل علیہ السلام کا دل ہے، جو غوث کے قلب کی مانند ہے۔

یہ تو ایسے مناصب تھے، جن کا ثبوت "سرمایۂ احادیث" سے مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہ احادیث خواہ کیسی

ہی مجروح اور موضوع ہوں۔ سب کچھ ان کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ حجت ہیں۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ان کے ہاں کئی ایسے مناصب بچ جاتے ہیں جن کے لئے آپ کو کوئی موضوع حدیث بھی نہیں مل سکی اور ان کا ثبوت ان کے بزرگان کرام کے اقوال ہیں۔ مثلاً :

اولیائے اللہ کے اعلیٰ مناصب

(۱) قطب کی اقسام اور ان کے فیوض حسبِ ذیل ہیں :

(ا) قطبِ ابدال عالم کے وجود اور اس کی بقاء سے تعلق رکھنے والے امور میں فیض کا واسطہ ہے۔ پیدائش، رزق، مصائب کے دُور ہونے اور صحت و آرام کے حاصل ہونے کا تعلق قطب ابدال کے فیض کے ساتھ مخصوص ہے۔"

(ب) قطب ارشاد۔ " ہدایت و ارشاد سے متعلق امور میں وصولِ فیض کا ایک واسطہ ہے۔ ایمان ہدایت، نیک کاموں کی توفیق اور توبہ وغیرہ کا تعلق قطبِ ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے۔" (معارف لدنیہ، امام ربانی، ص ۴۴، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۷۲)

(ج) "حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطب مدار کا معاون بنایا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بقا کا سبب بنایا ہے۔ اس کی برکت کی وجہ سے بقائے عالم ہے اور فرمایا کہ اس وقت قطبِ مدار یمن میں ہے اور وہ شافعیؒ فقہ کا متبع ہے اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔" (تفسیر مظہری، ۱۵: ۶۲، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۷۲)

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ :

۱۔ امام ربانی کا قطب ابدال اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کا قطبِ مدار ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ ان دونوں کا فیض ایک ہی قسم کا ہے یعنی وہ عالم کے بقا کا سبب ہیں اور یہ فیوض اسی قسم کے ہیں، جیسے نجوم پرست کسی مخصوص ستارہ کے اثرات بتلایا کرتے ہیں کہ رزق، پیدائش، مصائب وغیرہ فلاں فلاں ستارہ کی تاثیر ہے۔

۲۔ قطب کے متعلق زیادہ روایات تو یہ ہیں کہ وہ چار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی اقسام بھی چار ہو جاتیں، تو اچھا تھا، خواہ اُن کے فیوض ایک ہی جیسے ہوتے۔

منصب داروں کے مساکن اور فیوض

علامہ سیوطی نے کتانی سے جو روایت کی کہ " نقباء ۳۰۰، نجباء ۷۰، ابدال

۴۰، اخیار ۷، قطب ۴، اور غوث ایک ہے۔" تو اس کے آگے یہ روایت یوں چلتی ہے۔" نقباء کا مسکن مغرب (؟) نجباء کا مصر، ابدال کا شام ہے۔ قطب زمین کے گوشوں میں ہوتے ہیں اور غوث کا مسکن مکہ ہے۔ جب مخلوق کو عوامی مصیبت آجائے، تو دعا کے لئے نقباء ہاتھ پھیلاتے ہیں، اگر قبول نہ ہو تو پھر نجباء، پھر اخیار، پھر قطب اگر پھر بھی دعا قبول نہ ہو، تو پھر غوث دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔" (الخبر الدال، سیوطی ص۲۳، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۳۰)

علامہ سیوطی کی اس روایت میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں، مثلاً :

۱۔ نقباء کا مسکن مغرب ہے۔ مغرب اسمائے قبیلہ سے ہے، یہ تو وضاحت ہونی چاہئے تھی کہ سیوطی صاحب کے مسکن سے مغرب مراد ہے یا کوئی اور مقام؟

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفیاء نے زمین کو چپٹا مستطیل یا مربع شکل کا تصور کر رکھا ہے۔ جس کے چار گوشے ہیں اور ہر گوشے پر ایک ایک قطب اس زمین کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

۳۔ پیرانِ پیر کو غوث الاعظم کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ مکہ میں نہیں رہے۔ ان کا مولد، مسکن، مدفن سب کچھ بغداد ہے، پھر وہ غوثِ اعظم کیسے بن گئے؟

۴۔ اللہ تعالیٰ ان منصب داروں کی دعا بھی براستہ معروف یا (THROGH PROPER CHANNEL) ہی سنتا ہے۔ پھر وہ عام آدمیوں کی دعا کیونکر سن سکتا ہے۔؟ اور یہ بات قرآن کریم کے صریح خلاف ہے۔

۵۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد اگر غوث کی دعا بھی قبول نہ ہو تو کیا یہ دنیا تباہ ہو جائے گی؟ غوث کی دعا کی مقبولیت کی کیا ضمانت ہے؟ افضل الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے دعا کی کہ امت تفرقہ کا شکار نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔ آپ نے قبیلہ رعل اور ذکوان کے حق میں ہلاکت کی بددعا فرمائی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کے بعد ایک نافرمان بیٹے کے حق میں دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ کہہ کر رد کر دی، تو یہ غوث بیچارے آخر کس باغ کی مولی ہیں؟

۶۔ دعا بعض دفعہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن اس کا اثر بہت مدت بعد ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت موسٰے کی دعا قبول ہو گئی مگر اثر چالیس سال بعد ہوا، اور چالیس سال بعد بنی اسرائیل کو حکومت ملی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہو گئی مگر تیرہ سال بعد بیٹا پیدا ہوا۔ اب نقیبوں کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری

دُعا قبول نہیں ہوئی اب فوراً نجیبوں کو دُعا کرنا چاہئے۔ بہر حال اِن اولیاء کے پاس دُعا قبول ہونے یا نہ ہونے کو معلوم کرنے کے لئے انتظار کی مدت کیا ہے؛

قیوم یا انسان کامل

عام اہلِ تصوّف تو قطب کو سب سے بڑا اور آخری منصب قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ غوث ایک ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ مناصب ختم ہو بھی جانے چاہئیں، مگر بلند پایہ عارفین کے ہاں اس کے آگے بھی کئی مناصب ہیں اور وہ ہیں، قیوم، فرد، قطب وحدت اور صدیق۔

قیوم کے متعلق امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

" وہ عارف، جو قیوم کے منصب پر فائز ہو، وزیر کا حکم رکھتا ہے کہ مخلوق کے اہم امور کا تعلق اسی سے ہے، گو انعام تو بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں، مگر وزیر کی وساطت سے ملتے ہیں... معلوم ہوا کہ قیوم انسان کامل ہوتا ہے اور کُل احکام ظاہری اور باطنی قیوم کی ذات سے وابستہ ہیں۔ یہ مفہوم حدیث سے بھی متبادر ہوتا ہے " قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَ اللّٰہُ مُعْطِیْ یعنی میں تو تقسیم کنندہ ہوں۔ دینے والا اللہ ہے۔" (مکتوبات ۲:۷، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۴۳، ۴۴)

امام ربانی کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل الانبیاء ان کے نزدیک ان کے مقرر کردہ منصبِ قیومیت پر فائز تھے۔ دیکھا آپ نے حضور ﷺ کو کس گھٹیا مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔

پھر مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں:

" قیوم اولوالعزم رسول کا نائب ہوتا ہے وہ کل انعامات کا سبب ہوتا ہے۔ جب کہ قطبِ ابدال اور قطبِ ارشاد خاص ایک ایک انعام کا ذریعہ ہیں۔"

فرد اور قطب وحدت

" فرد اور قطب وحدت کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری سے ہوتا ہے (یعنی اس میں رسول ﷺ کا واسطہ نہیں ہوتا۔ مؤلف) اس لئے ان کا مرتبہ غوث اور قیوم سے بہت بلند ہوتا ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۴۴)

فرد اور قطبِ وحدت کے ثبوت میں مولانا اللہ یار خان نے ایک صحیح حدیث سے جس طرح استدلال فرمایا ہے اب وہ ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

" فرد اور قطبِ وحدت کا مفہوم بعینہٖ وہ حدیث ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے بطور دُعا غزوۂ بدر

میں زبان پر آئی :

اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ — الٰہی! اگر آپ نے اس جماعت اصحابہ کرامؓ کو ہلاک کر دیا

لَا تُعْبَدُ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا — تو پھر زمین پر کبھی بھی آپ کی عبادت نہ کی جائے گی۔

معرفتِ توحید ۔ فیضان کا عام ہونا اور جلد ہونا قطب وحدت اور افراد کی خصوصیات میں سے ہے اور معرفت ذات باری تعالیٰ اس سے وابستہ ہوتی ہے ۔" (دلائل السلوک، ص ۸۳)

دیکھا آپ نے دعوے اور دلیل میں کتنا زبردست تعلق ہے ۔ اب اگر ایسی نص قطعی کے باوجود بھی اولیاء اللہ کے ان مناصب یعنی فرد اور قطب وحدت پر ایمان نہ لائیں، تو اس میں مولانا موصوف کا کیا قصور ہے ؛ پھر مولانا نے تشریح میں توحید کے ساتھ معرفت اور فیضان کا عام اور جلد ہونا اور ان منصب داروں کا ذات باری تعالیٰ سے وابستہ ہونا کے الفاظ شامل کر کے سب کچھ اس حدیث سے ثابت کر دکھایا ہے۔

غوث قطب ابدال کا ثبوت پیرانِ پیر کی زبان سے

"اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں شمشیر برہنہ اور چڑھی ہوئی کمان ہوں ، میرا تیر نشانہ پر لگنے والا ، میرا نیزہ بے خطا اور میرا گھوڑا بے زین ہے۔ میں عشقِ خداوندی کی آگ ، حال و احوال کا سلب کرنے والا ۔ دریائے بیکران ، رہنمائے وقت اور غیروں سے باتیں کرنے والا ہوں ۔ ایک دفعہ آپ نے کیفیتِ حال میں فرمایا کہ میں ہوں محفوظ ، میں ہوں ملحوظ ، اے روزہ دارو ، اے شب بیدارو ! ، اے پہاڑوں پر بیٹھنے والو، خدا کرے تمہارے پہاڑ بیٹھ جائیں ، اور اے خانقاہ نشینو ! خدا کرے تمہاری خانقاہیں زمین دوز ہو جائیں ، حکمِ خدا کے سامنے آؤ ۔ میرا حکم خدا کی طرف سے ہے ۔ اے رہروانِ منزل ، اے ابدال ، اے اقطاب و اوتاد ، اے پہلوانو ، اور اے نوجوانو ! آؤ اور دریائے بیکراں سے فیض حاصل کر لو ۔ عزتِ پروردگار کی قسم ! تمام نیک بخت اور بدبخت میرے سامنے پیش کئے گئے اور میری نظر لوحِ محفوظ میں جمی ہوئی ہے ۔ میں دریائے علم و مشاہدہ الٰہی کا غوطہ خور ہوں ۔ میں تم سب پر اللہ کی حجت ، رسول کا نائب اور اس کا دنیا میں وارث ہوں ۔ پھر فرمایا کہ انسانوں کے بھی پیر ہوتے ہیں ۔ جنات اور فرشتوں کے بھی ، لیکن میں تمام پیروں کا پیر ہوں ۔" (اخبار الاخیار ، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی ترجمہ مولانا سبحان محمود صاحب ، ص ۴۹)

یہ ہیں پیرانِ پیر عبدالقادر جیلانیؒ، اس قدر جاہ و جلال کے مالک، جو جنوں انسانوں اور حتیٰ کہ فرشتوں اور جنوں کے بھی پیر ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی وفات کے چند ہی سال بعد عبداللہ بن یونس بن احمد وزیر جلال الدین ابوالمظفر نے آپ کے مکان کو مسمار کر کے آپ کی اولاد کو در بدر کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ کی قبر کھود ڈالی اور آپ کی ہڈیاں دریا (دجلہ) کی لہروں میں پھینک دیں اور کہا کہ یہ وقف کی زمین ہے۔ اس میں کسی کا دفن کیا جانا حلال نہیں ہے، تو آپ اس کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکے۔ (بحوالہ النجوم الظاہرہ، ص ۱۴۲، ج ۶)

اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ضیاء اللہ صاحب قادری نے اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" میں ص۲۴۱ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ابنِ یونس نے سیدنا غوث اعظم کی اولاد کو طرح طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچائی، یہاں تک کہ اس نے بغداد شہر سے بھی جلاوطن کر دیا۔ تو اللہ تعالےٰ نے اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ وَاَقْبَحُ مَوْتَہٗ اور اس کی بری طرح موت ہوئی (قلائد الجواہر، ص ۵۶) حضور غوث پاک کا ارشاد ہے:

وَنَحْنُ لِمَنْ قَدْ سَاءَنَا سُمٌّ قَاتِلٌ ۔۔۔ فَمَنْ لَّمْ یُصَدِّقْ فَلْیُجَرِّبْ وَیَعْتَدِہٖ

یعنی جو کوئی ہمیں اذیت پہنچائے ہم اس کے لئے سمِ قاتل ہیں۔ جس کو یقین نہ ہو، وہ اذیت پہنچا کر تجربہ کر لے۔" (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۲۴۲)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ ابنِ یونس کا آپ کی اولاد کو جلاوطن کرنے کا واقعہ درست ہے اور اس کی وجہ صاحب النجوم الظاہرہ نے بیان کر دی ہے۔

۲۔ جلاوطنی کی پاداش میں ابنِ یونس کے خاندان کی تباہی صاحب غوث الثقلین کا اپنا خیال ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت انہوں نے پیش نہیں کیا نہ ہی جلاوطنی کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

۳۔ عبدالقادر جیلانیؒ نے اذیت دینے والے کے لئے انتقام کا جو خطرناک نقشہ اپنے شعر میں بیان فرمایا ہے ہمیں افسوس ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے بالکل مخالف اور متضاد ہے۔

ولایت اور اس کے مناصب کا عزل و نصب

جس طرح سیاسی نظام میں بڑے افسر کی طرف سے کسی چھوٹے افسر کی تقرری ہوتی ہے اور نااہل ہونے پر اسے معزول کر دیا جاتا ہے۔ ولایت کے

سیاسی نظام میں بھی بالکل یہی صورتِ حال ہے۔ درج ذیل واقعہ سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے۔
" ایک واقعہ ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ سے آپ کا ایک مُرید کچھ بد اعتقاد ہوا اور اس غلط فہمی میں پڑا کہ اب میں بھی کسی مقام پر فائز ہو چکا ہوں۔ حضرت جنیدؒ سے کچھ اعراض کر لیا۔ چند روز بعد اس غرض سے آیا کہ تجربہ کرے اور دیکھے کہ میرا خیال جنید پر منکشف ہوا یا نہیں؟ اور حضرت جنیدؒ اپنے نورِ فراست سے اس کی حالت ملاحظہ فرما رہے تھے، جب وہ مرید آیا آپ سے کچھ سوال کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیسا جواب چاہتا ہے۔ الفاظ و عبارات میں یا حقیقتِ معنی میں؟ مرید نے عرض کی، دونوں طرح۔ آپ نے فرمایا: عبارتی جواب تو یہ ہے کہ اگر میرا تجربہ کرنے کی بجائے اپنا تجربہ کر لیتا، تو میرے تجربہ کا محتاج نہ ہوتا اور اس جگہ تجربہ کی غرض سے نہ آتا۔ اور معنوی جواب یہ ہے کہ میں نے تجھے منصبِ ولایت سے معزول کیا۔ یہ فرمانا تھا کہ مُرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا، چیخنے لگا اور پکارا کہ حضور راحت یقین میرے دل سے جاتی رہی۔ توبہ کرنے لگا اور پہلی بحواس سے ہاتھ اٹھایا۔ اس وقت حضرت جنید نے فرمایا، تو نہیں جانتا کہ اللہ کے ولی والیانِ اسرار ہوتے ہیں۔ تجھ میں ان کی ضرب کی برداشت نہیں۔ پھر ایک پھونک اس پر ماری۔ وہ پھر اپنے درجہ پر متمکن ہوا۔ اس وقت سے خاصانِ بارگاہ کے معاملات میں دخل دینے سے بھی توبہ کی اور پختہ عہد کر لیا۔" (کلام المرغوب اردو ترجمہ کشف المحجوب مصنفہ علی ہجویری صاحب، ص ۲۷۰، ۲۷۱)

اقتباس بالا سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ آپ خاصانِ بارگاہ میں سے تھے (گو صحیح منصب متعین نہیں ہو سکتا کہ کون سے منصب پر پہنچ کر ولی خاصانِ بارگاہ بنتے ہیں تاہم) وہ اپنے سے چھوٹے ولی کو معزول کر سکتے تھے۔

۲۔ اپنے سے بڑے مرتبے والے کے متعلق دل میں شک لانے سے بھی اتنی سزا مل سکتی ہے۔

۳۔ ولی اللہ واقفِ اسرار نہیں بلکہ والیانِ اسرار ہوتے ہیں، جبکہ صحابہؓ کو اور بعض دفعہ خود حضور اکرم ﷺ کو بھی ایسے باطنی امور کا پتہ نہ چلتا تھا۔

۴۔ ان کا تصرف واختیار اور ان کی مار اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان سے کمتر درجہ کے ولی بھی وہ ضرب برداشت نہیں کر سکتے۔

قاسمِ ولایت کون؟

علامہ عبدالقادر الاربلی مصنف تفریح الخاطر (ص ۳۸-۳۹، مطبوعہ مصر) بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین ص ۲۲۴ بزیرِ عنوان قاسمِ ولایت

فرماتے ہیں کہ "جب اللہ تعالٰی اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو ولی بنانا چاہتا ہے، تو حکم فرماتا ہے کہ اسے حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرو۔ (کسے حکم فرماتا ہے؛ علامہ اربلی غالباً یہ بات بتلانا بھول گئے۔ مؤلف) جب آپؐ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے، تو آپؐ فرماتے ہیں کہ اسے میرے بیٹے عبدالقادر جیلانی کے پاس لے جاؤ، تاکہ وہ اس کی اہلیت دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ منصبِ ولایت کا مستحق ہے یا نہیں؛ چنانچہ وہ دربارِ غوثِ اعظم میں پیش کیا جاتا ہے۔ آپ اس کو اگر منصبِ ولایت کے قابل دیکھتے ہیں، تو اس کا نام دفترِ محمدیہ ﷺ میں لکھ کر مُہر لگا دیتے ہیں۔ پھر اسے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے اور غوث اعظم کی تحریر کے مطابق نبی پاک ﷺ کا فرمان لکھا جاتا ہے۔ پس اس کو ولایت کی خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے، جو غوث پاک کے دستِ مبارک سے دی جاتی ہے۔ جب وہ اسے پہن لیتا ہے تو عالمِ غیب و شہادت (یعنی آدمیوں اور رجال الغیب) میں مقبول و مسلّم ہو جاتا ہے۔ پس اس عہدہ پر حضرت غوث پاک قیامت تک فائز رہیں گے اور اس مقام میں کوئی ولی آپ کے مماثل اور شریک نہیں ہے ہر زمان اور آن میں قطب، غوث اور تمام اولیاء اللہ آپ کی ذات منبع برکات سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔" (تفریح الخاطر، ص ۳۸، ۳۹)

اب دیکھئے جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) بھی اسی مرتبہ عزل و نصب پر فائز تھے اور یہ سلسلہ سہروردیہ کے جدِ اعلیٰ ہیں، لہٰذا علامہ اربلی صاحب غالباً انہیں معاف کر ہی دیں گے کیونکہ یہ غوثِ اعظم سے بہت پہلے کے ہیں۔ اسی طرح ایک اور صاحب ابوسعید چشتی بھی نظر آتے ہیں۔ جو اسی عزل و نصب کے منصب پر فائز ہیں (تفصیل آگے آئے گی) یہ ایک تو چشتی ہیں، دوسرے پیرانِ پیر کے تقریباً ہم عصر ہیں۔ اصل معاملہ تو بابا فریدالدین گنج شکر کا ہے، جو اسی سلسلہ قادریہ میں منسلک اور تیسری پشت میں آپ کے مُرید بھی ہیں۔ انہوں نے آخر یہ عزل و نصب کے اختیارات (جو تا قیامت عبدالقادر جیلانی کے لئے مخصوص تھے) کیوں غوث پاک سے چھین کر ان پر خود قبضہ کر لیا؟ (واقعہ کی تفصیل آگے آئے گی۔ بلحاظ ترتیب زمانی)

پیرانِ پیر کا ایک چور کو ابدال بنا دینا

اب عبدالقادر جیلانیؒ نے ان اختیارات عزل و نصب کو جس طرح استعمال کیا وہ بھی درج ذیل واقعات سے ملاحظہ فرمایئے:

"شاہ ابوالمعالیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ داؤد فرماتے تھے کہ ہمارے پیر جہانگیر (عبدالقادر جیلانی)

کے درِ دولت پر تمام اہلِ دولت وثروت بھی آتے تھے۔ ایک چور نے سمجھا بڑے مالدار ہوں گے اور ارادہ کیا کہ گھر میں گھس جاؤں اور دِلی مُراد پاؤں۔ وہ گھر میں داخل ہوا کچھ بھی نہ پایا اور اندھا ہو گیا۔ آنجناب پر اس سیاہ بے نور کا حال روشن تھا۔ خیال فرمایا کہ یہ بات مروّت سے بعید ہے کہ ہمارے گھر میں کامیابی کی خواہش سے آکر ناکام چلا جائے۔ آپ ابھی اسی خیال میں تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام آئے اور عرض کی کہ اے عالی ممالک کے والی! ایک ابدال اس وقت قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ جس کے لئے آپ حکم دیں اُس کی جگہ مقرر کیا جائے۔ آپ نے فرمایا ایک شکستہ دِل ہمارے گھر میں پڑا ہے۔ جاؤ اس کو لے آؤ تاکہ اسے بلند مرتبہ پر فائز کردیں اور حضرت خضر علیہ السلام گئے اور اس شخص کو آپ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ جس کو آپ نے ایک ہی نگاہِ لطف سے ابدال بنا دیا" (تحفہ قادریہ، ص ۱۹، ۲۰، خزینۃ الاولیاء فارسی، ج ۱، ص ۹۷، بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین، ص ۲۰۸)

اب دیکھئے اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے؛

۱۔ علامہ اربلی کے بیان کردہ دستورِ ولایت کو توڑنے والے خود غوثِ اعظم ہیں۔ اس چور کو نہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا نہ اُدھر سے آرڈر ہوا کہ اسے عبدالقادر جیلانی کے پاس لے جاؤ کہ وہ اس کی ولایت کی اہلیت کو ٹیسٹ کریں، تو پھر غوث پاک نے ایک چور کو ابدال بنا کر دھاندلی نہیں کی؟

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ مرنے والے ابدالوں کی اطلاع غوثِ اعظم کو دیا کریں اور نئے بننے والے ابدالوں کو غوث پاک کی بارگاہ میں حاضر کیا کریں۔

۳۔ جب چور گھر میں پہلے ہی موجود تھا، غوث پاک بھی گھر پر ہی تھے، تو حضرت خضر نے کس مقام سے اس چور کو آپ کے پاس حاضر کیا؟

اب دیکھئے اسی واقعہ کو باختلافِ روایت صاحب تفریح الخاطر (ص ۲۲) نے یوں بیان فرمایا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

"غوثِ اعظم مدینہ منورہ سے حاضری دے کر ننگے پاؤں بغداد کی طرف آرہے تھے۔ راستہ میں ایک چور کھڑا کسی مسافر کا انتظار کر رہا تھا کہ اُسے لُوٹ لے، آپ جب اس کے قریب پہنچے، تو پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا، بدو ہوں۔ آپ نے کشف کے ذریعے اس کی بدکرداری کو لکھا ہوا دیکھا۔ اتنے میں اُس چور کے دِل میں بھی خیال آیا کہ شاید یہ غوث اعظم ہیں۔ آپ کو چور کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے کا علم ہو گیا۔

اور فرمایا میں عبدالقادر ہوں، چور یہ بات سنتے ہی آپکے قدموں پر گر پڑا اور اس کی زبان پر "یَا سَیِّدِیْ عَبْدُ الْقَادِرِ شَیْئًا لِلّٰہِ" جاری ہوگیا۔ آپ کو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس کی اصلاح کے لئے بارگاہِ الٰہی میں متوجہ ہوئے تو غیب سے ندا آئی: "اے غوثِ اعظم اس چور کو سیدھا رستہ دکھادو اور ہدایت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اسے قطب بنادو۔ چنانچہ آپ کی ایک نگاہِ فیض رساں سے وہ قطب کے درجے پر فائز ہوگیا" (سیرۃ غوث، ص ۱۷۰، بحوالہ تفریح الخاطر ص ۲۲)

۱۔ اب دیکھئے کہ پہلی روایت کے مطابق چور آپ کے گھر کو لوٹنے آیا، لیکن اس روایت میں وہ راہ میں اسی غرض سے کھڑا تھا۔

۲۔ پہلی روایت میں آپنے حضور اکرم ﷺ کے واسطہ کو تو ختم کیا تھا مگر حضرت خضر علیہ السلام سے کچھ کام لیا تھا مگر اس روایت میں اُن کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حالانکہ چور دونوں واقعات میں پاس موجود تھا۔

۳۔ پہلی روایت میں آپنے چور کو ابدال بنایا تھا اس روایت کے مطابق قطب بنا دیا اور اس کی سابقہ اہلیت کو ہر دو بار ٹیسٹ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۴۔ پہلی روایت کے مطابق آپ کو اس لئے رحم آیا تھا کہ گھر سے خالی واپس نہ جائے اور دوسری روایت کے مطابق اس کے شَیْئًا لِلّٰہِ کے وظیفہ سے آپ کا دل بھر آیا۔ گویا آپ کی زندگی میں ہی اس وظیفہ کا رواج ہو چکا تھا جسے آپ بہت پسند فرماتے تھے۔

اب یہ واقعہ ایک ہی تھا جس میں تذکرہ نگاروں نے اتنا اختلاف پیدا کردیا یا واقعات ہی دو الگ الگ ہیں؛ یہ فیصلہ تو تذکرہ نگار ہی کریں گے۔ بظاہر یہ واقعہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ چوروں کو قطب یا ابدال بنا دیا کرتے تھے۔

پیرانِ پیر کا ایک کافر کو ابدال بنا دینا

ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۱۸۵ پر رقمطراز ہیں:

"ملک شام میں ایک ابدال انتقال کر گئے، تو آپ سر زمین عراق سے فوراً وہاں تشریف فرما ہوئے بعد ازیں حضرت خضر علیہ السلام اور دیگر ابدال بھی تشریف لے آئے سب حضرات نے ان کا جنازہ پڑھا بعد از جنازہ حضرت غوث پاک نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا کہ قسطنطنیہ میں فلاں کافر کو یہاں لے آئیں۔ حضرت خضر نے فی الفور اس کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ آپنے اس کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان

کیا۔ اُس کی مونچھوں کو پست کیا اور اپنی ایک ہی نظرِ کرم سے اُسے مقامِ ابدال پر فائز فرمادیا اور سب ابدالوں سے فرمایا کہ انتقال کرنے والے ابدال کے مقام پر اسے مقرر کرتا ہوں، جس پر سب ابدالوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔" (تتمہ شرح مسلم الثبوت، ص ۴۲۶، سفینۃ الاولیاء، ص ۶۵)

اس اقتباس سے درج ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ آپ اکثر چور اور کافر قسم کے لوگوں کو ہی ابدال بنایا کرتے تھے۔

۲۔ علامہ اربلی کے بیان کردہ دستورِ ولایت کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت خضر اس معاملہ میں آپکے کارندے کی حیثیت رکھتے تھے کہ نئے بننے والے ابدال کو آپ کے حضور پیش کیا کریں۔

اللہ تعالےٰ نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اُولوالعزم پیغمبر کو اُن کی خدمت میں بھیجا تھا، لیکن ان تذکرہ نگاروں نے مزید ڈھائی ہزار سال تک انہیں زندہ رکھ کر اُن کو غوث پاک کی چاکری پر مامور کر دیا ہے۔

۴۔ کسی بزرگ کا بیک وقت کئی مقامات پر بجسدِ عنصری موجود ہونا اور موجود ہو جانا گو کتاب وسنت کے صریح خلاف ہے تاہم اس طبقہ میں یہ مسئلہ "مُجمَعٌ عَلَیہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔

معین الدین چشتی اجمیری کو ہندوستان کس نے بھیجا؟

"شیخ نوراللہ لطائف القادریہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ معین الدین نے غوثِ اعظم سے عراق کا علاقہ مانگا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: "کہ عراق میں نے شہاب الدین سُہروردی کو عطا کر دیا ہے اور تم کو ہندوستان کا علاقہ عطا کرتا ہوں۔" (تفریح الخاطر، ص ۲۱۔ بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین، ص ۲۴۴)

اب دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

"مشہور ہے جب خواجہ (معین الدین) صاحب مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے گئے، تو وہاں آپ کو ہندوستان کے کفار میں تبلیغِ اسلام کا حکم ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ "خُدا نے ہندوستان کا ملک تیرے سپرد کر دیا ہے، وہاں جا اور اجمیر میں سکونت اختیار کر۔ خدا کی مدد سے دینِ اسلام تیرے اور تیرے ارادتمندوں کے تقوے سے اس سرزمین میں پھیل جائے گا۔" (روحِ تصوف، ص ۱۰۰۔ بحوالہ دعوتِ اسلام۔ پروفیسر آرنلڈ، ترجمہ عنایت اللہ، ص ۲۷۸، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور)

اس روایت کی تائید شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اپنی تصنیف تاریخ مشائخ چشت میں ان الفاظ میں کرتے ہیں ؛

"آپ دس محرم کو اجمیر رونق افروز ہوئے ۔ وہاں سب سے پہلے سید میر حسن بیعت ہوئے اس کے بعد ہزار ہا خلقت داخل سلسلہ ہوئی ۔ حضور اکرم ﷺ کے حکم کی بناء پر ہندوستان تشریف لائے ۔"
(تاریخ مشائخ چشت ، ص ۱۶۸)

اب تیسری روایت ملاحظہ فرمائیے ۔ یہی شیخ الحدیث اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۷ پر پہلے یوں لکھ چکے ہیں کہ :

"حضرت شیخ (عثمان ہارونی) ہندوستان کی ولایت پر آپ کو مامور کر کے حج کو تشریف لے گئے۔"

اب تینوں متضاد روایات سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں :

۱ خواجہ صاحب کو ہندوستان کس نے بھیجا ؟ یہ فیصلہ آپ خود کر لیجئے ۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ آپ کے پیر و مرشد عثمان ہارونی ہندوستان جانے کا آرڈر دے چکے تھے ، تو آپ نے غوثِ اعظم سے عراق کا علاقہ کیوں طلب کیا ؛

۲ پہلی روایت غوثِ اعظم کو قاسمِ ولایت تسلیم کرتی ہے ، لیکن باقی دونوں روایات اربلی صاحب کے بیان کردہ دستورِ ولایت پر خطِ تنسیخ پھیر دیتی ہیں کہ آپ قیامت تک کے لئے قاسمِ ولایت ہیں ۔

پھر بعد میں آنے والوں نے بھی اس دستورِ ولایت کی چنداں پرواہ نہ کی ، جس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کسی کو ولایت اسمِ اعظم کے طفیل ملتی رہی ، کسی کو شیخ کے حکم سے اور کسی کو بحکم الٰہی براہِ راست ، درمیان سے پیرانِ پیر کا واسطہ بالکل ساقط کر لیا جاتا رہا ۔

لمحہ بھر میں ضرب شدید کے ذریعہ ولایت کی عنایت

اب ایک تیسرے ولی اللہ ابو سعید چشتی صابری گنگوہی کا عام شخصوں کو ولی بنانے اور اس منصب پر فائز کرنے کا طریقہ بھی ملاحظہ فرمائیے : ان کا طریقہ واردات بالکل جداگانہ ہے ۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء رقمطراز ہیں کہ :

"سواطع الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص منکرِ حال ان (ابو سعید چشتی صابری گنگوہی ، م ۱۰۴۰ ھ) کے پاس آیا اور عرض کی میں طالبِ خدا ہوں مگر طاقت محنت ، عبادت و ریاضت کی مجھ میں نہیں ہے ۔

چاہتا ہوں کہ آپ کی نظرِ فیض اثر سے مقصودِ دل حاصل کرلوں۔ حضرت کے ہاتھ میں اس وقت عصا تھا۔ فرمایا کہ ہاں ہم اس عصا کی تین ضرب سے طالب کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر ایک ضرب عصا کی اس کے سر پر لگائی، عالمِ ملکوت اس پر کھل گیا، دوسری ضرب میں عالمِ جبروت، تیسری ضرب میں عالمِ شہود اس پر منکشف ہوگیا۔ تین دن تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا، صدقِ دل سے مُرید ہوگیا۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۷۳)

ہمارے خیال میں تو وہ کوئی بڑا ہی سخت جان مُرید تھا جس کو سر میں تین عصا کھانے سے صرف عالمِ ملکوت، جبروت اور شہود ہی روشن ہوئے، اس پر تو چودہ طبق روشن ہو جانے چاہئیں تھے۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جب اس پر یہ تینوں عالم منکشف ہوگئے اور وہ خدا تک بھی پہنچ چکا، تو پھر بعد میں مرید کس غرض سے ہوا۔

احکامِ ولایت کو چاک کر ڈالنا

اب پیرانِ پیر کے پوتے مُرید بابا فرید الدین گنج شکر کے عزل و نصب کا طریقہ ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت فرید الدین گنج شکر کا دستور تھا کہ جس خلیفہ کو کسی ملک کو روانہ کرتے، فرمان اپنے دستخط سے لکھ کر فرماتے کہ خواجہ جمال الدین ہانسوی سے جا کر مہر کرلو۔ اس رسم کے بعد جب علاؤ الدین علی احمد صابر بھی ہانسی پہنچے، چونکہ یہ خواجہ فرید الدین گنج شکر کے بھانجے، داماد اور ولایت میں سب سے بڑھ کر تھے، ان کے استقبال کے لئے خواجہ جمال الدین ہانسی سے دو میل باہر آئے۔ انہوں نے ان کی تکریم کی مگر جنڈول سے نیچے نہ اُترے اور خواجہ جمال الدین پاپیادہ ان کی سواری کے ساتھ رہے اور انہیں مسجد میں لے جا کر اتارا۔ شام کا وقت تھا۔ خواجہ جمال الدین نے انہیں مسجد میں امام بھی کیا۔ نماز کے بعد علاؤ الدین نے خواجہ جمال الدین سے فرمان پر مُہر کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا اب شام کا وقت ہے کل صبح کردوں گا۔ یہ بات سنتے ہی علاؤ الدین نے داہنے ہاتھ کی بڑی انگلی کو پھونکا۔ اس پھونک سے انگلی شمع کی مانند روشن ہوگئی۔ فرمایا: "اب روشنی ہوگئی ہے۔ فرمان پڑھ کر مُہر کردو۔" یہ بات سن کر خواجہ جمال نے فرمان پھاڑ کر کہا کہ "دلّی بیچاری تیری ایسی آتشیں دم ولایت سہارنے کی قوت نہیں رکھتی۔" اس بات پر علاؤ الدین کمال ناراض ہوئے اور فرمایا "تو نے میرے فرمان کو پھاڑ ڈالا، میں نے تیری ولایت کو پھاڑ ڈالا۔" جمال الدین نے کہا "اوّل سے یا آخر سے؟" کہا "آخر سے۔"

"یہ بات کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ فرید کی خدمت میں آکر کُل حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا" پارہ کردۂ جمال را فرید نتواں دوخت "(یعنی جمال کے پھاڑے ہوئے فرید سی نہیں سکتا)" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۷۹)

اب دیکھئے اس عزل ونصب کے تنازعہ میں تین فریق ہیں۔ (۱) فریدالدین آرڈر دینے والے۔ (۲) جمال الدین ہانسوی اور (۳) علاؤالدین صاحب، مہر لگوانے والے۔ فریدالدین صاحب، علاؤالدین صاحب کو مہر لگوانے بھیجتے ہیں، تو علاؤالدین شام کے بعد انگلی روشن کرکے اصرار کرتے ہیں کہ ابھی مہر کردو۔ جمال الدین صاحب اس بیجا تقاضا پر برافروختہ ہوکر آرڈر ہی پھاڑ دیتے ہیں، تو اب مُہر کروانے والے علاؤالدین اگرچہ غرض مند ہیں تاہم فریدالدین فرمان کنندہ کے بھانجا ہونے کی بنا پر جمال الدین مُہر کنندہ کی ولایت ہی پھاڑ دیتے ہیں، لیکن اس کی ولایت کو آخر سے پھاڑتے ہیں، اول بچا رہتا ہے۔ یہ کارنامہ سرانجام دے کر یہ علاؤالدین بھانجہ صاحب' اپنے ماموں بابا فریدالدین، فرمان کنندہ کے پاس پہنچے مگر یہ فرمان کنندہ بھی معذوری کا اظہار کرتے ہیں کہ جس فرمان کو جمال الدین نے پھاڑ دیا اسے میں سی نہیں سکتا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ علاؤالدین علی احمد صابری ولی تھے یا نہیں ؟ اور انہوں نے جو جمال الدین کی ولایت کو آخر سے پھاڑ ڈالا تھا، اس کا نتیجہ کیا نکلا ؟ وہ ولی رہے یا نہیں ؟

پھر یہ بھی غور فرمائیے کہ بابا فریدالدین یہ خیال نہیں فرماتے کہ عزل ونصب کا یہ مقام نواب قیامت تک اُن کے دادا پیر یعنی پیرانِ پیر کو حاصل ہے۔ آپ خواہ مخواہ ان کا یہ منصب اور حق غصب فرما رہے ہیں اور علامہ اربلی کے بیان کردہ دستور کی بھی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔

دورِ نبویؐ کا باطنی نظام

اب اس باطنی سیاسی نظام کی تفصیل جناب عبدالعزیز قادری مصنفہ "سرچشمۂ حیات" کی زبان سے سنیئے۔ ساتھ ساتھ کتابوں کے دیئے گئے حوالہ جات بھی ملاحظہ فرماتے جائیے :

"اسلام سے پہلے اس جہان کا اندرونی نظام فرشتوں اور اولیائے جنات کے سپرد تھا۔ آنحضرت نے انسانوں کو بھی اس کا باقاعدہ حصہ دار بنایا اور پانچ سال قبل از ہجرت پندرہ ممالک کا انتظام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس نظام میں منسلک کیا۔" (حقیقت گلزار صابری، صفحہ درج نہیں، بحوالہ سرچشمۂ حیات، ص ۶۶)

دیکھ لیا آپ نے کس قدر مستند، مدلل اور بصیرت افروز بیان ہے گلزار صابری صاحب کا۔ اس کی کس کس بات پر تبصرہ کیا جائے۔ نشان زدہ نکات خود دیکھ لیجئے۔

باطنی نظام کا ثبوت قرآن سے

پھر قادری صاحب اس باطنی نظام کا ثبوت قرآن کریم سے یوں پیش فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ	ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ بے شک
الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ	زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، سو
الصَّالِحُوْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	میرے اس فرمان میں عبادت گزاروں کے واسطے
لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِيْنَ	بشارت (؟) ہے۔

بَلٰغًا کا ترجمہ 'بشارت' کرنے کی مصلحت قادری صاحب ہی سمجھتے ہیں۔ پھر اس آیت کی تشریح فرماتے ہیں:

"زمین کی اس وراثت سے مراد سلطنتِ کاملہ اور حکومتِ باطن ہے اس کے حاکم (یعنی قطب ابدال وغیرہ) چاہیں تو دنیا کے بادشاہوں کو بادشاہت سے معزول[1] کر دیں۔ رہی حکومتِ ناقصہ (یعنی ظاہری حکومت) تو وہ مشرکوں، کافروں، بے دینوں، سب کے لئے عام ہے۔" (سروری کلاچوی)

پھر اس بیان مذکورہ پر قادری صاحب خود ہی ایک اشکال پیش کرتے ہیں کہ: صحابہ جیسے اہلِ باطن کا باہمی جنگ و جدل بعید نظر آتا ہے، تو اس کا حل یہ پیش کرتے ہیں:

"شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر اور اس کے بعد جتنے واقعات پیش آئے تھے، ان میں سے ایک ایک کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بہم پہنچا چکے تھے۔ اس لئے ان واقعات کو خدا تعالیٰ کی اٹل تقدیرات سے سمجھا جا چکا تھا اور ایسے موقع پر اہل باطن امرِ تقدیری کو پورا کر دینے کے لئے پُرجوش ہوتے ہیں۔" (فتوحات مہاجر کی)

یہ حل ہے یا مزید الجھاؤ؟ کیا سب صحابہ اہلِ باطن اور جبریہ عقیدہ کے قائل تھے؟ جو تقدیر کو پورا کرنے کے لئے دیدہ دانستہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے پر تُل گئے تھے۔

پھر قادری صاحب فرماتے ہیں۔ "یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ اُحد میں تشریف لے گئے حالانکہ آپ کی ذاتی رائے میدانِ اُحد میں جانے کے خلاف تھی اور اس لئے لڑائی کے لئے کوئی دُعا نہ

---

[1] اس کے مقابلہ میں قرآن کریم کا ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے: قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء

مانگی۔ حالانکہ بدر کے لئے آپؐ نے خضوع وخشوع سے دُعا مانگی تھی۔" (مثنوی شریف)

پھر قادری صاحب دوسرا اشکال پیش فرماتے ہیں۔ "اولیاء اللہ کافروں کی فوجیں معنوی طاقتوں سے تباہ کردیا کریں، تو لڑائی کی نوبت ہی نہ آئے۔" اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ" باطن بغیر ظاہر کے مکمل نہیں۔"

(سرچشمۂ حیات، از عبدالعزیز قادری، ص ۶۹ تا ۷۱، مطبوعہ تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور)

اب سوال یہ ہے کہ اگر باطن، ظاہر کے بغیر مکمل نہیں اور ظاہر باطن کے بغیر سب کچھ کر رہا ہے، تو اس باطن کا فائدہ کیا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ ان اہل باطن کے ریت پر تعمیر کئے ہوئے محل محض پروپیگنڈا اور جہلاء کی اندھی عقیدت کے سہارے قائم ہیں۔ جن کے پیچھے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ شرعی دلائل کے ایک ہی جھونکے سے یہ محل زمین بوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے بلند بانگ دعوے یہ ہیں کہ بقول مولانا رومؒ

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ   تیرِ جستہ باز گرداننَد زراہ

ترجمہ: اولیاء اللہ کو اللہ کی طرف ایسی قدرت (تصرف) حاصل ہوتی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی بے بسی

اور جو لوگوں کی موت وحیات پر تصرف کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جب خود ان پر کوئی حادثہ پیش آتا ہے، تو فوراً راہِ فرار اختیار کر جاتے ہیں۔ اس وقت نہ اُن کی دعا کام آتی ہے اور نہ کرامت۔ مثلاً حدیقۃ الاولیاءؒ کے مصنف مفتی غلام سرور صفحہ ۸۰ پر شیخ کرم شاہ قریشی حارثی ہکاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"پہلے ان کی سکونت لاہور میں تھی۔ جب غارت گراں قوم سکھ نے پنجاب میں ہنگامہ غارتگری گرم کیا، تو یہ بزرگ لکھنؤ چلا گیا اور چند سال اپنے نانا شیخ نور الحسن قریشی کے ساتھ بسر کئے۔ مراجعت کے وقت متصل شاہ جہان پور ۱۲۰۱ھ میں قزاقوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ رضی اللہ عنہ ۱۲۰۱، اس کا سال وفات ہے۔"

اور معروف کرخیؒ (م ۲۰۰ھ) کی وفات یوں ہوئی کہ آپ وفات سے چند روز پہلے اپنے پیر طریقت امام موسیٰ رضا (شیعوں کے آٹھویں امام) کی ملاقات کے لئے گئے۔ دربانوں نے اندر نہ جانے دیا۔ جب اصرار پر نوبت پہنچی، تو پاسبانوں نے شیخ معروف کو زدوکوب کیا جس سے اُن کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہی صدمہ آپ کی موت کا باعث ہوا۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱) اس وقت نہ امام صاحب کا "نورِ باطن" کام آیا نہ معروف کرخیؒ کا نہ ہی امام موصوف کی دُعا اور دم جھاڑ اپنے خلف الرشید کے کسی کام آ سکے۔

بابا نور محمد تیراہی المعروف بابا جیو (م ۱۲۸۴ھ) کا فرار یا ہجرت؟

آپ مادرزاد ولی تھے آپ پر الزام لگایا گیا کہ آپ کا طریقہ جوگیانہ ہے اور آپ اپنے مریدوں کو ایک ہزار مرتبہ یومیہ 'یا ابلیس' پڑھنے کو بتاتے ہیں۔ افغانی یہ باتیں سن کر آپ کے خلاف ہوگئے اور آپ کے مریدوں کو لُوٹنے لگے، کچھ عرصہ تو آپ برداشت کرتے رہے بالآخر تیزی شریف سے موضع اڑاوڑ چلے گئے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۲۹۱)

اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ان اولیاء کے شیخ اکبر پر بھی مصر میں کُفر کا فتوٰی لگا اور ان کے قتل کا حکم حاصل کر لیا گیا، تو انہوں نے بھی چپکے سے راہِ فرار اختیار کی اور دمشق میں آکر پناہ لی تھی۔ غرض اس طرح کے واقعات بھی بے شمار ہیں جن سے ان کی خدائی کی اصل حقیقت کھُل کر سامنے آجاتی ہے اور جن میں سے چند واقعات آپ کو اس کتاب میں دیگر مقامات پر مل جائیں گے۔

اہلِ باطن پر علمائے حق کی گرفت

اب سوال یہ ہے کہ اگر ان صوفیائے کرام کا مذہب ایسے ہی مشرکانہ عقائد و اعمال کا مرقع ہے، تو اہلِ ظاہر نے اِن پر کوئی گرفت بھی کی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب مختصراً حسبِ ذیل ہے:

حکومتوں سے سزا دلوانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عبداللہ بن سبا یہودیوں کے چیلوں یعنی حلولیوں نے اپنے عقائد کا اظہار کیا، تو انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زندہ جلا دیا تھا۔ اس سخت سزا کی وجہ سے یہ فتنہ کافی عرصہ دبا رہا۔

اس کے بعد جب منصور حلاج نے یہی بات کہی، تو علمائے حق نے اس پر بھی بروقت گرفت کی خلیفہ مقتدر باللہ نے ۳۰۹ھ میں اور بقولِ بعض ۳۱۰ھ میں اسے قتل کرا دیا۔ پھر اسے دفن نہیں کیا گیا بلکہ اِسے جلا کر اس کی راکھ دریا میں پھینک دی گئی۔

ابوعبداللہ الحکیم ترمذی نے تیسری صدی کے آواخر میں جب نظریۂ ختم الولایۃ پیش کیا اور تصوف کے بعض دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی تو علمائے وقت نے بڑی شورش کی اور اس پر کُفر کا فتوٰی بھی لگایا آخر اُس نے اپنی جان بچانے کی خاطر ترمذ سے راہِ فرار اختیار کی اور جلاوطن ہو کر بلخ میں جا کر پناہ لی۔

پھر ہمیں تاریخ میں ایک اور صُوفی بزرگ شہاب الدین سہروردی المقتول کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بزرگ ایک صوفی اور فلسفی کی حیثیت سے پہلے اصفہان میں رہے پھر بغداد بعد ازاں وہاں سے حلب چلے گئے۔

جب ان کے صُوفیانہ عقائد نے مسلمانوں کے دِل میں اُن کی طرف سے شبہات پیدا کر دیئے اور راسخ الاعتقاد علماء نے ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا، تو ابو الملک الظاہر نے ۵۸۷ھ میں ان کو بعمر ۳۶ یا ۳۸ سال قتل کر دیا۔ (دائرۃ المعارف، ج ۱۱، ص ۷۰۴ زیرِ عنوان شہاب الدین سہروردی المقتول)

ابنِ عربی پر بھی وحدت الوجود کی اشاعت وتشہیر کی پاداش میں کفر کا فتوٰے لگایا گیا اور اسے زندیق، ملحد اور کذاب جیسے بدترین القاب سے نوازا گیا اور مصر میں ان کے قتل کا حکم بھی حاصل کر لیا گیا۔ ان کو اس کا پتہ لگ گیا تو چپکے سے راہِ فرار اختیار کی اور دمشق میں آکر دَم لیا۔

عفیف الدین تلمسانی قرآن وحدیث کے خلاف خرافات بکتا تھا مگر نہایت رازداری سے اور جب اُسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں کمال الدین اس کا راز فاش نہ کر دے، تو اپنے اس شاگرد کے پاس آیا اور منت ومعذرت سے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے یہ خرافات پردۂ راز میں رہنے دے۔

اس کے بعد امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کا دور آتا ہے انہوں نے اپنے وقت کے موجودہ رفاعی، بدعتی اور مشرک فرقے سے حکومتی سطح پر مناظرہ ومباہلہ کیا، جس میں یہ رفاعی بزرگ ہار گئے (حالانکہ حکومت کے اکثر اہلکاروں پر ان رفاعی شعبدہ بازوں کا اچھا خاصا اثر تھا) اور معذرت طلب کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی بدعات وخرافات سے باز آئیں گے اور خلافِ شریعت کام نہیں کریں گے۔

ہند میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں حکیم سرمد نے خدائی کا دعوٰے کیا، تو اسے ۱۰۷۰ھ میں قتل کیا گیا۔

یہ تو تعزیری اقدامات تھے، اب تحریری بھی سُن لیجئے:

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پہلی اور دوسری صدی میں ایسے بزرگوں کو زاہد، عابد یا صالح کہا جاتا تھا، صوفیاء کی اصطلاح بعد میں وضع ہوئی۔ یہ لوگ چونکہ فقر وفاقہ، دنیا سے بے رغبتی اور نفلی عبادت مثلاً نماز، روزہ میں سنت سے آگے بڑھ گئے اور غلو سے کام لیتے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں یا ان کے معتقدین میں اپنے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی خاطر موضوعات اور جھوٹ کا بھی رواج ہو گیا تھا۔ چنانچہ امام مسلم اپنی کتاب 'مسلم' کے مقدمہ میں مندرجہ ذیل روایت درج فرماتے ہیں:

امام مسلم اور صالحین

قال محمد بن یحیٰی بن سعید القطان عن ابیہ قال: لم نرا الصالحین فی شیئ اکذب	محمد بن یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں کہ میرے باپ یحیٰی نے کہا: "ہم نے صالحین سے زیادہ کسی کو حدیث

منهم في الحديث " قال ابن ابی عتاب فلقيت انا محمد بن يحيیٰ بن سعيد القطان فسألته عنه فقال عن ابيه : " لم تر اهل الخير في شيء اكذب منهم في الحديث " قال مسلم يقول يجرى الكذب على لسانهم ولا يتعمدون الكذب (مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۴، ۱۲، مصری)

کے معاملہ میں جھوٹ بولنے والا نہیں دیکھا۔" ابن ابی عتاب کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے محمد بن یحییٰ بن سعید القطان کی ملاقات ہوئی۔ اور میں نے ان سے یہی بات پوچھی، تو کہنے لگے: "ہاں میرے والد فرماتے تھے کہ تو ان اہل خیر (صوفیا) سے زیادہ کسی کو بھی حدیث کے معاملہ میں جھوٹا نہ دیکھے گا۔" امام مسلم کہتے ہیں کہ "جھوٹ ان کی زبانوں سے بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے۔ چاہے جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ بھی رکھتے ہوں۔"

صالحین سے حدیث قبول کرنے میں تامل

چنانچہ آئمہ حدیث اس طبقہ صالحین سے حدیث قبول کرنے میں متامل رہتے تھے۔ ان حضرات میں زہد اور عبادات میں غلو کی وجہ سے ان کی روایات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کا ظن اور ضرورت سے زیادہ احتیاط "علم" کے نکات پر حاوی رہتے تھے۔ چنانچہ مشہور حدیث "پانی پاک ہے جب تک اس کا رنگ، ذائقہ اور بُو متغیر نہ ہو" کے سلسلہ میں "رشدین بن سعد" کی روایت کو محض "اَخَذَتْهُ غَفْلَةُ الصَّالِحِيْن" کی بنا پر قبول نہیں کیا گیا۔ (متفرق کتب اسمائے الرجال) حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے مگر سلسلۂ اسناد میں ایسے صلحاء کا نام آنے سے محدثین پرہیز کرتے تھے اور جب تک دوسرے ثقہ راویوں سے توثیق نہ ہو اسے قبول نہ کرتے تھے۔

صُوفیا کا شجرہ طریقت

امام مسلمؒ کہتے تھے کہ اس دین (طریقت) کے ذریعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ مقدمہ مسلم میں فرماتے ہیں:

حدثني حسن بن علي الحلواني قال حدثنا يزيد بن هارون اخبرنا همام قال دخل ابو داؤد الاعمىٰ على قتادة فلما قام قالوا ان هٰذا يزعم انه لقي ثمانية عشر بدريًا فقال قتادة هٰذا كان سائلاً قبل الجارف

مجھ سے حسن بن علی حلوانی نے بیان کیا ان کو یزید بن ہارون نے، ان کو ہمام نے خبر دی کہ داؤد اعمیٰ (نابینا) قتادہ (تابعی) کی محفل میں داخل ہوا۔ جب جانے لگا تو اہل مجلس نے کہا کہ یہ داؤد اعمیٰ دعویدار ہے کہ اس نے اٹھارہ بدری صحابیوں سے ملاقات کی ہے۔ قتادہ نے فرمایا "یہ تو طاعون جارف سے

لا یعرض فی شیئٍ من هٰذا ولا یتکلم فیه و
اللهِ ما حدثنا الحسن عن بدريٍ مشافهة
ولا حدثنا سعید بن المسیب عن بدريٍ
مشافهة إلا عن سعد بن مالك (مقدمہ صحیح مسلم ص۱۱، مصری)

پہلے مانگتا پھرتا تھا۔ اس وقت تو اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہ
کی تھی۔ خدا کی قسم! حسن (بصری) اور سعید بن المسیب (جو
داؤد اعمٰی سے عمر میں بڑے تھے) نے بھی سوائے سعد بن مالک
کے کسی بدری صحابی سے کوئی حدیث ہم تک نہیں پہنچائی۔

ملا علی قاری نے بھی اپنی تصنیف "موضوعات" میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ صوفیاء جو اپنی نسبت حضرت حسن بصری کے ذریعہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاتے ہیں، تو آئمہ حدیث کے ہاں حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تو ملاقات بھی ثابت نہیں۔ تحصیلِ علم تو بڑی بات [1] ہے

(بحوالہ اسلامی تصوف، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۱۲۰)

دائرۃ المعارف الاسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی) میں صوفیاء کے شجرہ طریقت پر طویل بحث کی گئی ہے

---

[1] مولانا اللہ یار خان اپنی تصنیف دلائل السلوک کے صفحہ ۲۰۳ پہ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"صوفیاء کرام تو سب کے سب حضرت حسن بصری اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات پر متفق ہیں۔ اہلِ حدیث کے ہاں ملاقات او رؤیت بالاتفاق ثابت ہے ہاں صحبتِ طویلہ کی بالاتفاق نفی ہے۔ اگر فیض کے لئے صحبتِ طویلہ کو شرط قرار دیا جائے، تو پھر بھی فیض باطنی بالواسطہ تو ممکن ہے، محال نہیں۔ ہاں فیض بلاواسطہ کی نفی ہو گی مگر بالواسطہ کی نفی کہاں لازم آئی .... اب رہا یہ سوال کہ اگر کسب فیض بالواسطہ کا اصول تسلیم کر لیا جائے، تو وہ واسطہ کون سا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے ملنے والے ہزاروں صحابی حضرت حسنؒ سے ملے تھے۔ کسی سے فیض حاصل کر لیا ہو۔ یہ کوئی ظاہری چیز تو ہے نہیں کہ ظاہری چیز کی نفی سے باطنی فیض کی نفی ہو جائے۔"

اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں کہ یہ صوفیاء اپنا شجرہ نسب ملانے کے لئے ظاہری صحبت کے محتاج نہیں۔ بھلا جن کے ہاں نسبتِ اویسیہ جیسا کارگر ذریعہ موجود ہو، انہیں اس ظاہری ملاقات یا صحبت کو ثابت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ جواب دینے کے بعد آپ نے سید احمد شاہ نقشی، شاہ ولی اللہ دہلوی، تہذیب التہذیب اور جلال الدین سیوطی کے چند اقتباسات اور روایات سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات، سماع اور روایت ثابت ہے۔ اب ایک طرف ان حضرات کے اقوال سامنے رکھئے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ:

۱ امام مسلم خدا کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ حسن (بصری) اور سعید بن المسیب نے بھی کسی بدری صحابی سے کوئی حدیث ہم تک نہیں پہنچائی۔ (مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۱، مصری)

۲ اور ملا علی قاری مصنف "موضوعاتِ کبیر" ان کی ملاقات بھی تسلیم نہیں کرتے (اسلامی تصوف، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۲۰)

۳ اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ اس سلسلہ نسب کو اپنی پوری تحقیق کے بعد منحول قرار دیتا ہے۔

ایں صورت جوبات راجح ہو سکتی ہے اس کا آپ خود اندازہ فرما لیجئے۔

کیونکہ اس میں بہت سے اختلافات ہیں۔ بالآخر جو نتیجہ پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے آخر میں چودھویں صدی عیسوی میں استاد ابن ابی اُصَیبعہ نے جو شجرہ طریقت مرتب کیا ہے اسے اس وقت سے بہت بڑے بڑے صوفی سلسلے تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور وہ شجرہ طریقت یوں ہے:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ۲۔ حسن بصری، م ۱۱۰ھ) ۳۔ حبیب الاعجمی (م ۱۵۶) ۴۔ داؤد طائی
۵۔ معروف کرخی (م ۲۰۶ھ) ۶۔ سری سقطی (م ۲۵۳ھ) ۷۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) ۸۔ رازدباری
۹۔ ابو علی کاتب زجاجی ۱۰۔ مغربی ۱۱۔ جرجانی۔

یہ شجرہ درج کرنے کے بعد دائرۃ المعارف میں ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی درج ہے:

"ابن الجوزی اور ذھبی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس شجرہ میں قدیم ترین چار واسطے یعنی ۱ تا ۴ منحول (کمزور) ہیں۔ یہ بزرگ آپس میں ملے ہی نہیں تھے۔ بعض طریقت کے سلسلے ایسی اسناد استعمال کرتے ہیں۔ جس میں معروف کرخی سے پہلے نو شیعی[1] امام آتے ہیں۔

اس سلسلہ اسناد کی صحت اور بھی زیادہ مشکوک ہے۔" (دائرۃ المعارف الاسلامیہ، زیر عنوان تصوف، ج ۶، ص ۴۲۶)

صوفیائے پر محدثین کی گرفت کے اثرات

اہلِ تصوف کی اوّلین کتابوں میں سے ایک مستند کتاب ابو نصر سراج کی کتاب "اللمع" ہے۔ اس کے متعلق دائرہ معارف اسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد ۱/۱۴، ص ۱۲۵ زیرِ عنوان علمِ تصوف) پر درج ہے کہ:

"کتاب اللمع تصوف کی اوّلین کتابوں میں سے ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانہ میں تصوف کے خلاف اعتراض میں خاصی شدت آگئی تھی جن کے ازالے کی اس نے خاص ضرورت محسوس کی۔ ان شکوک کی خاصی طویل فہرست کتاب کی ابتدائی فصل میں موجود ہے۔ ...

"ابو نصر سراج (م ۳۷۸ھ) سب سے زیادہ اصحاب الحدیث کے اعتراضوں سے خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں کو سب سے زیادہ مطمئن کرنا چاہا ہے۔ یہاں تک کہ نعتِ طبقات اہل الحدیث کے لئے ایک

---

[1] یعنی ۱۔ حضرت علیؓ (م ۴۰ھ) ۲۔ حضرت حسنؓ ۳۔ حضرت حسینؓ (م ۶۱ھ) ۴۔ زین العابدین (م ۹۵ھ) ۵۔ امام باقر (م ۱۱۴ھ) ۶۔ جعفر صادق (م ۱۴۹ھ) ۷۔ موسیٰ کاظم (م ۱۸۳ھ) ۸۔ موسیٰ رضا (م ۲۰۳ھ) ۹۔ محمد بن علی تقی (م ۲۲۱ھ) قادری اور سہروردی اپنا سلسلہ آٹھویں امام موسیٰ رضا سے ملاتے ہیں جبکہ چشتی حضرت علی۔ حسن بصری سے آگے عبدالواحد بن زید کی طرف منتقل کرتے ہیں

پورا باب وقف کیا گیا ہے۔"

پھر اسی عنوان کے تحت ایک دوسرے مقام پر درج ہے کہ :

"ابو نصر سراج کے ہاں اس امر کی کوشش نظر آتی ہے کہ تصوف کے اصولوں اور عقیدوں کو محدثین اور فقہاء کے طریقے پر بیان کیا جائے تاکہ طریقت کو شریعت کا ہم خیال بلکہ اس کے تابع ثابت کیا جا سکے۔" کوشش یہ کی گئی ہے کہ تصوف کو علوم شریعت میں مقام مل جائے اسی لئے تطبیق و موافقت کی سعی ہر جگہ نمایاں ہے۔ کتاب کے آخر میں اکابر صوفیاء کے بعض الفاظ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو صاف کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دینی حلقوں کے لئے قابلِ قبول بنایا جائے۔"

صوفیاء پر فقہاء کی گرفت

دائرۃ المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی (جلد ۱۲، زیرِ عنوان طریقت، ص ۴۶) پر درج ہے کہ:

"راسخ العقیدہ فقہاء نے ان بدعتوں کے خلاف، جن کی تبلیغ بعض صوفی طریقے کرتے رہے۔ ہمیشہ جنگ جاری رکھی، یعنی ان کی نفلی عبادتوں، ان کے مخصوص لباس (خرقہ وغیرہ) ان کی مستشنیات، نشی اشیائ (قہوہ، حشیش، افیون) ان کی شعبدہ بازی اور ان کے عقیدے کے خلاف اسناد بیعت پر مؤرخانہ تنقید پر خاص توجہ کی ہے اور ان کے سلسلوں کے رخنوں اور نقائص کو ظاہر کر کے ان کی صحت کو غیر اغلب قرار دیا ہے۔"

اس کے بعد سلف اور خلف میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اہلِ حمیت اور محافظینِ شریعت نے جب کسی کا کوئی ایسا قول دیکھا جو اس کو شریعت کے نصوص اور اس کے متواتر و قطعی عقائد کے خلاف نظر آیا، تو انہوں نے اس قول کی تردید کی اور صاحبِ قول کی عظمت و شہرت اور اُس کی ولایت و مقبولیت کے آثار بھی اس کو اس تردید سے باز نہ رکھ سکے۔ ایسے محافظینِ شریعت میں سے بعض لوگوں نے اس موضوع پر مستقل رسائل بھی تصنیف کئے ہیں۔ صاحبِ جلاء العینین نے صفحہ ۴۳، ۴۴ پر ایسے اصحاب کے کارنامے درج کئے ہیں۔ اس فہرست میں ہم کو علامہ سخاوی، علامہ سعد الدین تفتازانی، ملا علی قاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، ابو حیان مفسر، شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام، حافظ ابو ذر، (شیخ) الاسلام سراج الدین البلقینی جیسے نامور علماء و آئمہ فن نظر آتے ہیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۲، ص ۱۵۲، از ابو الحسن علی ندوی)

☆

امام ابنِ تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کے کارنامے

اور ان سب میں ہمیں امام ابنِ تیمیہؒ سرِفہرست نظر آتے ہیں مندرجہ بالا سب حضرات ان کے ہمنوا تھے۔ امام ابنِ تیمیہؒ نے جس طرح تقریر و تحریر اور حکومتی سطح پر مناظرہ و مباہلہ کر کے ان صوفیوں کے مشرکانہ عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اسے ہم پہلے مناسب مقام پر درج کر آئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابنِ تیمیہؒ خود بھی زاہد تھے، ان سے کرامات کے صدور کے واقعات بھی ملتے ہیں اور ان کی بعض تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان منازل سلوک کو ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے صوفیوں کے ان سب مشرکانہ عقائد و بدعات کا نہایت سختی سے ردّ کیا جن کی شریعتِ اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ خود اتباعِ سنت اور عقائدِ سلفیہ میں نہایت تشدد تھے۔

امام ابنِ تیمیہؒ نے کئی محاذوں پر ان وجودیوں کا مقابلہ کیا۔ انہیں نجی طور پر خطوط بھی لکھے کہ وہ ایسے عقائد اور خلافِ سنت اعمال سے باز آئیں۔ پھر ایک رسالہ "فی ابطال وحدت الوجود" بھی لکھا اور ایسے مشرکانہ عقائد رکھنے والوں کے حق میں دو ٹوک فتوے دیا۔ جس کا ملخص یہ ہے:

"ایک اسلامی مملکت میں صرف تین فرقے ہی ہو سکتے ہیں۔ (۱) مسلمان (۲) ذمی جیسے یہود و نصاریٰ یا دوسرے کافر۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی عبادت کی ادائیگی کی حد تک تو آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے دین کی کھلم کھلا تبلیغ نہیں کر سکتے۔ پھر وہ چونکہ جزیہ ادا کرتے ہیں لہٰذا وہ بھی مسلمانوں ہی طرح محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ (۳) مشرک و مرتد اور زندیق وغیرہ۔ یہ لوگ چونکہ مسلمانوں میں شامل ہوتے ہیں، لیکن اپنے مشرکانہ عقائد اور بدعات پھر ان نظریات کی علی الاعلان تبلیغ کی وجہ سے وہ واجب القتل ہوتے ہیں اس کے علاوہ ان کا کوئی علاج نہیں۔ ان سے پہلے توبہ کروائی جائے اگر باز نہ آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ اور نہ ہی ایک اسلامی مملکت میں کسی چوتھے فرقہ کی گنجائش ہے۔"

(امام ابن تیمیہؒ، کوکن عمری، ص ۱۶۶)

امام ابنِ تیمیہؒ کے شاگردِ رشید امام ابنِ قیم بھی اپنے استاد کی طرح جہاں ایک متبحر عالم، محدث اور فقیہ تھے، ساتھ ہی ساتھ صوفی بھی تھے۔ انہوں نے بھی جہاں سلوک پر متعدد کتب و رسائل لکھے۔ وہاں ابو اسمٰعیل عبداللہ ہروی (م ۴۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح مدارج السالکین بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں صوفیاء کے غلط عقائد اور غلو کی جا بجا نشان دہی کر کے شدید گرفت کی ہے۔

صاحبِ جلاء العینین نے جن علماء کے نام گنوائے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء بھی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے ان مشرکانہ عقائد کے خلاف بھرپور جدّوجہد کی ہے۔ علاّمہ ابن خلدون، علامہ ذہبی، ابن المقری، ابراہیم البقاعی اور مجدد الف ثانی رح

مجدد الف ثانی رح کا کمال یہ ہے کہ جہاں وہ تبع سنت اور عالم دین تھے وہاں طریقت میں بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے بربنائے کشف نظریہ وحدت الوجود اور شہود کو ہیچ قرار دیا اور اس کا ابطال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیاء میں سے بھی کسی کو کھل کر آپ کے نظریات کے خلاف لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آپ نے اپنے کارہائے نمایاں سے اس بے دینی اور بد مذہبی کا رُخ بدل دیا، جو اکبر کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی مجدد صاحب نے ابن عربی شیخ اکبر کے اس نظریے کا بھی رد کیا کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی ہے۔ (حضرت مجدد کا نظریہ توحید، ص ۳۶)

مجدد الف ثانی رح کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کا نام اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ صوفیاء میں جو پیر پرستی اور گور پرستی کے رجحانات پائے جاتے ہیں اس کے خلاف انہوں نے بھرپور جدّوجہد کی ہے۔ لیکن ان کا یہ پہلو کمزور ہے کہ وہ خود ان نظریات کے قائل رہے ہیں اور مجدد الف ثانی کے نظریات سے تطبیق کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح ایک بزرگ اشرف علی تھانوی قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے تصوّف میں غیر اسلامی عقائد و اعمال کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کا دوسرا پہلو شاہ ولی اللہ صاحب سے بھی زیادہ کمزور نظر آتا ہے وہ صرف ان نظریات کے قائل ہی نہیں اکابر اور بدنام صوفیا کے خلافِ شریعت اقوال و افعال کی ہر ممکن تاویل و تعبیر سے تنزیہہ کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

البتہ عبداللہ غزنوی جن کے متعلق نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ وہ جامع حدیث نبوی اور علم سلوک تھے۔ انتہا درجہ کے متبع سنّت بزرگ تھے۔ انہوں نے بھی کھل کر وحدت الوجود کے نظریہ کی مخالفت کی ہے۔

الغرض علمائے شریعت نے ہر دور میں ان مشرکانہ عقائد کی بیخ کنی کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ان کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

باب ۴

صوفیاء کے مخصوص مسائل (۱)

۱۔ اولیاء اللہ اور ان کی گرفت

اولیاء اللہ کون ہیں؟

اولیاء اللہ کی فضیلت میں عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۶۲/۱۰) سُن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان اولیاء اللہ سے یہی لوگ مراد ہیں، جو چلّہ کشی اور قبروں پر مراقبے کرتے، خوارق عادات امور کا اظہار کرتے اور صاحب تصرّف و اختیار بنے ہوتے ہیں۔ قرآن اولیاء اللہ کی اس تعریف کا انکار کرتا ہے۔ وہ اولیاء اللہ کی تعریف اس سے اگلی آیت میں یوں بیان کرتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۶۳/۱۰) یعنی وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔

اولیاء اللہ کی بعینہٖ یہی تعریف درج ذیل آیت میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس آیت کے مخاطب کون لوگ ہیں:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے گی، پھر جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

مندرجہ بالا دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں، جو اللہ کی ہدایت پر ایمان لائے اور اس کی پیروی کرتے ہیں، نہ کہ وہ لوگ جو خود خدائی کے دعویدار بن بیٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ولی کو مومنین کی صفت قرار دیا تھا۔ ان صوفیاً نے ولی کو ایک منصب میں تبدیل کر دیا۔

اولیاء اللہ و الیانِ اسرار ہوتے ہیں

سید الطائفہ جنید بغدادیؒ ولی کی یہ تعریف بیان کرتے ہیں کہ "ولی والیانِ اسرارؒ ہوتے ہیں۔" یعنی وہ خُدا کے سربستہ رازوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر یہ تعریف عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ وہ سمجھنے لگے کہ جس طرح لڑکی کا ولی یا سرپرست اس کے نکاح کا مختار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا کے ولی اور سرپرست ہوتے ہیں۔ اور اس سے حسبِ منشا کام کروا سکتے ہیں۔

بلاشبہ اولیاء کا لفظ قرآن میں سرپرست یا صاحبِ اختیار کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کسی کی بگڑی بنا سکتا ہو یا کسی کی حاجت پوری کر سکتا ہو۔ لیکن اس صورت میں یہ ہمیشہ منفی پہلو لئے ہوتے ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کا یہ گمان باطل ہوتا ہے کہ وہ لوگ صاحبِ تصرف و اختیار ہیں۔ مثلاً:

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۴۲/۶)	اور جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں۔ اللہ ہی ان پر نگران ہے اور آپ کسی کے وکیل نہیں۔

یعنی پیر اور مُرید کے ان احوال کا محاسبہ اور موازنہ اللہ ہی کا کام ہے۔ اے پیغمبر تمہارے ذمہ یہ بات نہیں کہ جو بات نہ مانے اس کو تہس نہس کر سکو۔

اس آیت کے حاشیہ میں مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ اس آیت کے مخاطب بظاہر حضور ہی ہیں، لیکن اصل مدعا کفار کو یہ بتلانا ہے کہ اللہ کا نبی اس طرح کا کوئی دعوٰے نہیں رکھتا، جیساکہ جاہلیت کے معاشروں میں بالعموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ "یہ حضرت" قسم کے لوگ ہر اس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، جو اُن کی شان میں گستاخی کرے۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کر گزرے یا اور کچھ نہیں، تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آئے تو اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر ان "حضرتوں" کا اپنا پھیلایا ہوا ہوتا ہے اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے ان کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کاروبار کا سرمایہ بنانے کے لئے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ ان کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہرحال عوام میں اسے روحانیت اور خدا رسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی فریب کا طلسم توڑنے کے لئے اللہ تعالےٰ حضور ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ آپ

لہ کلام المرغوب اردو ترجمہ کشف المحجوب، ص ۲۷۱۔

کا کام صرف لوگوں کو راہ دکھانا ہے ان کی قسمتیں تمہارے حوالہ نہیں کی گئیں۔ ان کے اعمال کو دیکھنا اور ان کو عذاب دینا ہمارا اپنا کام ہے۔"

اسی طرح درج ذیل آیت میں بھی اولیاء سے مراد یہی "حضرت" قسم کے لوگ ہیں، فرمایا:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۷/۳)	جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو (یہی اصل ولایت ہے) اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ مگر تم کم ہی نصیحت مانتے ہو۔

ولی کے مفہوم میں تبدیلی کب ہوئی؟

قرآن کی رُو سے تمام بنی نوع انسان دو فرقوں میں منقسم ہے۔ ایک اولیاء اللہ یا اولیاء الرحمٰن، دوسرے اولیاء الشیطان۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے دین کو قبول کرتا ہے اور اس کی سربلندی کے لئے کام کرتا ہے، وہ اللہ کا ولی ہے۔ خواہ یہ کوشش کم ہو یا زیادہ۔ اور جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا اور بغاوت کرتا ہے وہ شیطان کا ولی ہے۔ تمام کے تمام انسان ولی ضرور ہیں۔ کوئی اللہ کا ولی ہے اور کوئی شیطان کا۔ اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷)	جو لوگ ایمان لائے، اللہ ان کا ولی ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان ہیں، جو ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔

گویا مومنوں کا اللہ اور وہ اللہ کے ولی اور کافروں کے شیطان ولی اور یہ شیطان کافروں کے ولی ہوتے ہیں لیکن اس طبقہ نے اولیاء سے مراد صرف وہ فرقہ سمجھ رکھا ہے، جس سے کشف و کرامات یا شعبدہ بازیوں کا ظہور ہو۔ پھر اسی طبقہ میں سے کسی کو اللہ کا ولی کہہ دیتے ہیں اور کسی کو شیطان کا۔

ولی کا مفہوم کب سے بدلا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مفہوم کی تبدیلی تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئی۔ دوسری صدی تک ایسے لوگوں کو زہاد، عباد یا صالحین تو کہا جاتا تھا مگر اولیاء اللہ کسی نے نہ کہا تھا جب چوتھی صدی ہجری میں صوفیاء کے طبقہ کے مختلف رسائل ضبطِ تحریر میں آئے، تو ان حضرات نے ولی

کے لفظ کو اس مفہوم کے لئے مختص کر لیا۔ پھر اس کے بعد ان اولیاء اللہ کے مناصب اور اسامیاں مقرّر کی گئیں، جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ذاتی اور عطائی کا فلسفہ

طریقت کے نظریات کے مطابق (خواہ حلول کے نظریہ سے ہو یا وحدت الشہود کے نظریہ سے) سب عارف باللہ اور فنافی اللہ لوگ انسانی رُوپ میں چلتے پھرتے خُدا ہوتے ہیں۔ جن کا علم اور تصرف خدا ہی کے برابر ہوتا ہے فرق صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا کا علم غیب یا تصرف تو اس کا ذاتی ہے اور ان اولیائے کرام کا علم غیب یا تصرف خدا کا عطا کیا ہوا یا عطائی ہوتا ہے۔ اب اس ذاتی اور عطائی کے متعلق بھی شریعت کا فیصلہ سن لیجئے۔ مشرکین مکہ بھی جو فرشتوں، بزرگوں اور بتوں میں علمِ غیب یا تصرف کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ حج کے دوران تلبیہ ان الفاظ میں کہا کرتے تھے:

لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ

میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک جو تیری مِلک ہے اور تو اس کا مالک ہے اور وہ شریک تیرا مالک نہیں۔

(مسلم، کتاب الحج، باب التلبیہ .....)

گویا ایسے ذاتی اور عطائی کا نظریہ رکھنے والوں کو بھی مُشرک ہی قرار دیا گیا۔ اب مولانا رُوم کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے، جو ان صُوفیہ کے مسلمہ عقیدہ کی ترجمانی کرتا ہے:

اولیاء راہست قدرت از اِلٰہ تیر جُستہ باز گردانند ز راہ

ترجمہ: اولیاء اللہ کو اللہ سے یہ قُدرت حاصل ہوتی ہے کہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس موڑ لائیں۔

خداؤں کی تعداد

اب اس کا دوسرا پہلو سامنے لائیے، کیا بیک وقت اتنے صاحب تصرف حضرات کی موجودگی کا امکان بھی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا

اگر آسمان اور زمین خدا کے سوا اور معبود ہوتے، تو نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا (۲۱/۲۲)

یہاں اللہ کا لفظ صاحب تصرف و اختیار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر کسی میں تصرف کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر ایک کے بجائے دو بھی ایسی صاحب تصرف و

اختیار ہستیاں ہوں تو زمین و آسمان اور کائنات کا نظام دُرست رہنا ناممکن ہے۔ چہ جائیکہ سینکڑوں بیک وقت موجود ہوں۔

دوسرے مقام پر ان صاحب تصرف و اختیار ہستیوں کے تصرف کی نفی اِن الفاظ میں بیان فرمائی؛

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی
لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ	بھی نہیں بنا سکتے، خواہ سب اکٹھے ہو جائیں اور اگر ان
وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا	سے مکھی کچھ چھین لے جائے، تو اس سے واپس بھی
یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ	نہیں لا سکتے۔ طالب اور مطلوب (مرید اور پیر)
وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲/۷۳)	دونوں کمزور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کے تصرّف و اختیار کا مسئلہ ایک اور مثال سے بھی سمجھایا ہے۔

فرمایا:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ	اللہ تعالیٰ تمہارے حسبِ حال ایک مثال فرماتا ہے، کہ
هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ	بھلا جن (نوکروں وغیرہ) کے تم آقا ہو، تم انہیں اس
مِّنْ شُرَكَآءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰكُمْ	حال میں شریک بناتے ہو، جو ہم نے تم کو دیا ہے تاکہ
فَاَنْتُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ	نوکر اور آقا برابر حیثیت کے بن جائیں؟ تم اس معاملہ میں
كَخِیْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۳۰/۲۸)	ان سے یوں ڈرتے ہو جیسے اپنوں سے۔

تو بھلا جب تم آقا کی حیثیت سے غلام کی شراکت گوارا نہیں کر سکتے، تو جس خدا کے سب غلام ہیں۔ وہ ان کی شراکت کب گوارا کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کا صاحب تصرف ہونا ایک بیہودہ سی بات اور صریح شرک ہے۔

ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ کا عقیدہ

اب چونکہ قرآن ہر مسلمان اور مومن کو اللہ کا ولی قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ولایتِ عامہ اور ولایتِ خاصہ کا عقیدہ تراشا گیا۔ ولایتِ عامہ تو عام مسلمانوں کے لئے رہنے دی گئی اور ولایتِ خاصہ اِن صاحب تصرف "اولیاء اللہ" کے لئے۔ اب دیکھئے کہ ایمان بھی مسلمانوں میں کم و بیش ہوتا ہے۔

کوئی کمزور ایمان والا ہوتا ہے کسی کا اس سے پختہ ہوتا ہے کسی کا اس سے بھی زیادہ پختہ اور اکمل، لیکن ایمان کو دو یا زیادہ حصوں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، تو پھر آخر اس ولایت کی یہ تقسیم کیوں کی گئی پھر اس تقسیم کے لیے کوئی خطِ امتیاز بھی ہونا چاہئے کہ ولایتِ خاصہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ خطِ امتیاز منصوص تو ہے نہیں اور ان کا اپنا معیار یہ ہے کہ جن لوگوں سے کشف و کرامات سرزد ہوں تو وہ ولایتِ خاصہ کے مالک ہوتے ہیں اور عام مومن یا مسلمان ولایت عامہ کے مستحق۔ اگرچہ عرفِ عام میں انہیں ولی نہیں کہا جاتا۔

پھر جب کشف و کرامات ہی ولایتِ خاصہ کا معیار ٹھہرا، تو اس کشف و کرامات کی حقیقت کا حال بھی راہِ طریقت کے ایک جادہ پیما اور عارف باللہ خواجہ حکیم انصاری کی زبان سے سن لیجئے:

"دورانِ سلوک میں ہر قسم کے صوفیوں اور فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے بڑی عجیب معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے ہر طرح اور ہر رنگ کے فقیر دیکھے۔ مثلاً قلندر، ملنگ، رِندولی، رقص و سرود کے رسیا مئے ناب کے متوالے اور خصوصاً رسول شاہی، جو نماز روزے سے منع کرتے، شراب اور چرس وغیرہ کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور خلاف شرع اعمال کرتے ہیں۔ کشف و کرامات ان سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔ مزید تحقیق پر پتہ چلا کہ یہ سب وحدت الوجود کو ماننے والے ہیں، جن کو اسلامی تصوف اور فقر محمدی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہندوؤں کے لوگ اور دوسری مشقوں کے ذریعے روحانی طاقت پیدا کر لیتے ہیں۔" (حقیقت وحدت الوجود، ص ۲۱)

تو یہ ہے کشف و کرامات کی حقیقت جسے ولایتِ خاصہ کا معیار قرار دیا گیا ہے اور ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ تذکروں میں مذکور اکثر اولیائے کرام اسی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ متبع سنت اور مشرکانہ عقائد سے مبرا اولیائے کرام کی اگر چھان بین کی جائے تو شاید وہ پانچ فیصد بھی نہ نکلے۔

اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام

۱۔ امام جعفر صادق کی بے ادبی کا انجام

ایک اور راوی نے بیان کیا "میں امام جعفر کے ساتھ جا رہا تھا۔ برسرِ راہ ایک

خشک کھجور کا درخت نظر پڑا آپ نے فرمایا: "اے کھجور! ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کرو۔ کھجور اُسی وقت سرسبز ہو گئی۔ اُس پر خوشے لگ گئے اور امام کی طرف جُھک گئے۔ ہم دونوں نے کھجوریں کھائیں جو اتنی میٹھی تھیں کہ میں نے زندگی بھر ایسی کھجوریں نہ کھائی تھیں۔ ایک اور شخص وہاں کھڑا تھا۔ کہنے لگا "کیا زُود اثر جادو ہے۔" آپ نے فرمایا "یہ جادُو نہیں دُعا ہے جسے اللہ تعالےٰ نے قبول فرمایا۔ تم چاہو تو ابھی دُعا کروں اور تم کُتا نظر آنے لگو۔" اعرابی اپنی سگ طبعی کے باعث کہنے لگا "اچھا کر لو" حضرت نے دُعا کی، تو وہ کتا بن کر اپنے گھر جانے لگا۔ حضرت امام نے مجھے حکم دیا کہ "اس کتے کے پیچھے پیچھے جاؤ۔" جب وہ اعرابی اپنی اہلیہ کے پاس گیا، تو دُم ہلانی شروع کر دی۔ اس نے ڈنڈا اٹھایا اور گھر سے نکال دیا۔ وہاں سے نکل کر پھر امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں لیٹنے لگا اور آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ حضرت کو اُس کی حالت پر رحم آگیا اور دُعا کی تو وہ اپنی اصلی حالت میں آگیا۔" (خزینۃ الاصفیاءؒ، ص ۸۸)

اب یہ بھی غنیمت سمجھئے کہ اس "ایک اور راوی" کو اس اعرابی پر رحم آگیا۔ وگرنہ اگر وہ یوں لکھ دیتا کہ جب کتا آکر آپ کے قدموں میں لیٹنے لگا، تو آپ کہہ دیتے کہ "اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔" جیسا کہ کئی اولیاؒ ایسا بھی کہہ دیتے ہیں اور ہمیشہ کُتا ہی رہتا۔ تو وہ ایک اور راوی اس بات کے بھی پورے حقوق رکھتا تھا۔ غور فرمائیے ان راویوں نے اولیاء اللہ کی عوام پر ہیبت بٹھلانے میں کیسا مؤثر کردار ادا کیا ہے اور کیسے کیسے افسانے تراشے ہیں۔

۲۔ امام موسیٰ رضا اور قالین کے شیر

امام موسیٰ رضا کو مامون الرشید نے ولیعہد مقرر کیا تھا۔ ایک دن آپ خلیفہ مامون کے پاس اپنی مسندِ آرام پر بیٹھے تھے کہ ایک حاسد اور بدخواہ بھی آگیا اور امام صاحب کو کہنے لگا کہ "اگر تم اتنے ہی صاحبِ کرامت ہو، تو خلیفہ کے دربار میں بچھی ہوئی قالین پر شیروں کی تصویر کو زندہ کر کے دکھاؤ اور انہیں مجھ پر مسلط کر دو۔ اگر ایسا کرو تو یہ کرامت اور معجزہ ہوگا۔" اس بدگفتار کی یہ گفتگو سنتے ہی حضرت امام نے غضبناک ہو کر شیروں کو للکارا اور کہا کہ اس کذاب اور دشمنِ اہلِ بیت کو پکڑ کر اپنا تر نوالہ کر لو۔ حکم ملتے ہی دونوں تصویریں شیر بن کر جھپٹیں اور شہنشاہِ ولایت کے اس بدگو کو اپنے خونیں پنجوں میں دبا کر اس کا ہڈی گوشت سب چبا گئے۔ پھر فرش پر گرے ہوئے خون کے قطروں کو چاٹنے لگے۔ خلیفہ مامون یہ منظر دیکھ کر زمین پر گر گیا دونوں شیر اب امام کی پابوسی کے لئے آئے اور زبانِ حال سے کہنے لگے۔ "اگر آپ حکم فرمائیں تو اس غدار

خلیفہ کو، جو ظاہر میں آپ کی دوستی کا دم بھرتا ہے مگر دلی طور پر دشمنِ اہلِ بیت ہے، کیفرکردار تک پہنچا دیں۔" آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کو ابھی اس کی زندگی مطلوب ہے۔ تم جس طرح تھے اسی طرح ہو جاؤ" چنانچہ دونوں بہادر شیر اپنی اصلی حالت پر چلے گئے اور شیر قالین بن گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۰۳)

دیکھا آپ نے کیسا ہولناک انجام ہوتا ہے اولیاء اللہ کی بے ادبی کرنے والوں کا۔ یہ سب کچھ درست مگر دو باتیں کھٹکتی ہی رہ گئیں:

۱۔ دربار میں فرش پر قالین بچھے ہوتے تھے۔ جب شیر نے اس بدگفتار کو تر نوالہ بنایا، تو اس کے خون کے قطرے تو قالینوں میں جذب ہو گئے ہوں گے۔ بعد میں شیر کون سے فرش سے خون کے قطرے چاٹنے لگے تھے۔

۲۔ امام موسیٰ کے والد موسیٰ کاظم نے ہارون الرشید کی جیل میں وفات پائی۔ اُنہیں زہر دیا گیا۔ پھر آپ کو بھی زہر دیا گیا۔ پھر آپ کے بیٹے امام تقی کو بھی زہر دیا گیا، تو اگر امام موصوف کو اللہ نے کرامات کی اتنی قوت بخشی تھی، تو آپ کے خاندان کا یہ حال کیوں ہوا؟

۳۔ جنید بغدادیؒ اور جلوہ گری

ایک بار شیخ جنید کے ایک مرید سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی۔ وہ ندامت کے مارے باہر چلا گیا اتفاقاً راہ میں شیخ سے دوچار ہو گیا۔ شیخ کی نظر پڑی تو ہیبت سے ایسا گرا کہ سر پھٹ گیا۔ چند قطرے خون کے زمین پر گرے جن سے لفظ "اللہ" لکھا گیا۔ شیخ نے جب یہ دیکھا تو فرمایا: "اچھا! میرے سامنے جلوہ گری کرتا ہے۔" خدا کی قسم! یہ بچے جو میرے سامنے کھیل رہے ہیں، اس مقام میں تیرے برابر ہیں۔" شیخ کی یہ بات اتنی گراں گزری کہ جاں بحق ہو گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۱)

شاید جنید بغدادی صاحب کو اس اپنے گناہ پر نادم مرید کے مرنے کے بعد کچھ رحم آ گیا ہو اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کر دی ہو؟ تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ وہ اس لئے کہ اس طرح جو دھاک وہ اولیاء اللہ کی عوام پر بٹھانا چاہتے ہیں، اس میں کمی واقع ہونے کا امکان تھا۔

۴۔ عبدالواحد کی گستاخی کا انجام

حدیقۃ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرور اس کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر ایک بزرگ "شیخ عبدالواحد" کا ذکر فرماتے ہیں:

"ایک بے ادب عورت نے جس کا بیٹا حضرت کی بیعت میں آکر تارک الدنیا و مجذوب ہوگیا تھا، حضرت کے رُوبرو بے ادبی کے کلمات کہنے شروع کئے۔ حضرت نے صبر کیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ آخر جب دیکھا کہ غیرتِ الٰہی درپے انتقام ہے، تو اپنے خادم کی طرف اشارہ کیا کہ اس عورت کو ایک طمانچہ مار۔ خادم نے زبانی عورت کو منع کیا اور طمانچہ لگانے میں متامل رہا۔ عورت اسی وقت گری اور مرگئی۔ حضرت اپنے خادم پر کمال غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ اگر تو طمانچہ لگانے میں دیر نہ کرتا، تو اس عورت کی جان برباد نہ ہوتی، کیونکہ اس حالت میں اس بدگوئی شدید کا انتقام میری طرف سے ہوجاتا اور اب منتقم حقیقی نے یہ انتقام لیا اور جان اس کی جاتی رہی۔ خون اس عورت کا تیری گردن پر ہے۔"

غور فرمایا آپ نے عوام کو اولیاء اللہ کے باطنی تصرف سے بھی اور ان کی بے ادبی کرنے سے مرعوب کرنے کے لئے کیسا افسانہ تراشا گیا ہے کہ آئندہ سب لوگ عبرت حاصل کرلیں۔

بخاری و مسلم دونوں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ "کسی شخص نے حضور اکرم ﷺ سے کچھ قرض لینا تھا اس نے آکر شدید تقاضا کیا اور سخت سُست الفاظ کہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت ناگوار گزرا، تو انہوں نے جوابی کارروائی کا ارادہ کیا، تو آپؐ نے فرمایا" اسے چھوڑ دو، کیونکہ صاحبِ حق کو باتیں کرنے کا حق ہوتا ہے۔" دیگر بہت سے انبیاء کی لوگ بے ادبی، گستاخی، توہین، مارپیٹ حتیٰ کہ انہیں قتل بھی کرتے رہے لیکن بسا اوقات غیرتِ الٰہی یوں جوش میں نہ آئی، صرف اس بزرگ پر کیوں اتنی جوش میں آگئی کہ پل بھر میں اس عورت کو جان سے ختم کر ڈالا؟

۵۔ انتقام سے بچئے

اب ایک دوسرے بزرگ "خواجہ علاؤالدین صابر کلیری" کے غضب کا واقعہ سنیئے:

آپ کو خواجہ فریدالدین گنج شکر نے کلیر بھیجا۔ چند ماہ گزر گئے لوگ کچھ متوجہ نہ ہوئے۔ ایک دن آپ جُمعہ کی نماز پڑھنے گئے، تو امام کے مصلّٰی پر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے کہا: "یہ قاضی کی جانماز ہے۔ کسی دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔" آپ نے فرمایا: "قاضی سے بڑھ کر رتبہ قُطب کا ہے اور ہم اس سرزمین کے قُطب ہیں۔" لوگوں نے یہ بات ہنسی میں اڑادی اور زبردستی وہاں سے اُٹھادیا۔ آپ پیچھے آکھڑے ہوئے۔ حضرت کو کوئی جگہ نماز پڑھنے کو نہ ملی، تو مسجد کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا: "لوگ سجدہ کرتے ہیں تو بھی سجدہ کر۔" یہ بات سنتے ہی مسجد مع چھت اور دیوار کے ان پر گر پڑی اور سب لوگ نیچے آکر ہلاک ہوگئے۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۷۰)

اب گستاخی کا قصور تو تین چار آدمیوں کا ہوگا، لیکن آپ نے غضب میں آکر سب لوگوں کو ہلاک کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ مسجد کو بھی۔ اور ان کا قصور فقط یہ تھا کہ وہ اس بزرگ صاحب کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے

ستوں چشمِ بد دُور ہیں آپ دیں کے ‌ ‌ ‌ ‌ نمونہ ہیں خُلقِ رسولِ امیں کے

۶۔ جانوروں سے بھی انتقام

اور پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر کے کسی کا بیڑہ غرق کرنے کا قصہ تو زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔ پورے بارہ سال بعد آپ نے پھر اپنی "نظرِ کرم" سے اس غرق شدہ بیڑے کو تار دیا۔ آپ کی یہ "نظرِ کرم" جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا کرتی تھی۔ مثلاً چند درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ایک دفعہ ایک چیل آپ کی مجلس وعظ کے اُوپر منڈلانے لگی اور چلّانے لگی، آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اُس کا سر پکڑ لے۔ آپ کا یہ فرمانا تھا کہ اس بیچاری چیل کا سَر جُدا ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پھر آپ منبر شریف سے اُترے اور سر اور دھڑ دونوں ملا کر بسم اللہ پڑھا اور اپنا ہاتھ مبارک پھیرا، تو وہ اللہ کے اذن سے زندہ ہو کر اڑنے لگی اور لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۶۵ کے علاوہ مزید تذکروں کے حوالے، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۹۲)

۲۔ اسی طرح ایک روز ایک چوہے کی سختی آگئی۔ جو چھت سے مٹی گرا رہا تھا۔ تین دفعہ آپ پر مٹی گری، چوتھی دفعہ جو گری، تو آپ نے جلالت سے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا طَارَ رَأسُكَ آپ کا یہ فرمانا ہی تھا کہ چوہے کا سر ایک طرف اور دھڑ ایک طرف جا گرا۔ (تحفہ قادریہ، ص ۲۲، قلائد الجواہر، ص ۳۵ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۲۱۱)

۳۔ ایک دفعہ وضو کے دوران ایک چڑیا نے آپ پر بیٹ کر دی، تو آپ نے جلالیت سے دیکھا، تو سَقَطَ مَيِّتًا یعنی وہ اسی وقت گر کر مر گئی۔ (حوالہ ایضاً)

گویا جو چیز بھی آپ کی طبعِ نازک پر گراں گزرتی۔ آپ فوراً اپنی نظرِ کرم سے اس کو جان ہی سے ختم کر ڈالتے تھے۔ غور فرمایئے اس انتقامی کارروائی کی رحمۃ للعالمین کے اسوۂ حسنہ سے کچھ مشابہت ہے؟

۷۔ مُردہ ولی کے انتقام سے بھی بچیئے

یہ تو خیر زندہ ولیوں کی گستاخی کی بات تھی۔ اب دیکھئے۔ ان کے مزارات سے گستاخی کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ ذکر "حضرت ایشاں" کا ہو رہا ہے:

"خان دوران صوبہ دار لاہور جو خشک مُلّا تھا اور مشائخ عظام کے ساتھ اس کو کمال عداوت تھی برسرِ پرخاش ہوا اور مجاور کو بلا کر کہا کہ اس روضے کو گرا دیا جائے۔ مجاور نے جواب دیا مجھ کو گرانے کا اختیار نہیں، آپ کو اختیار ہے تو گرا دو۔ دوسرے دن صوبہ دار وہاں آیا اور اسے گرانے کا حکم دیا مگر جب وہاں سے لوٹ کر شالا مار باغ کو چلا۔ تو راستہ میں گھوڑے نے ناخن لیا، گھوڑے سے گرا، گردن ٹوٹ گئی تین دن زندہ رہ کر مر گیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ الْاَوْلِیَاءِ" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۱۲۲)

اب دیکھئے کہ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں خود حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مہم پر روانہ کیا، جو روضے، قبّے، مزار اور ایک بالشت سے اونچی قبریں ہیں، سب کو گرا کر ہموار کر دیا جائے اور ان خداؤں کی خدائی کا خاتمہ کیا جائے۔ آج پھر کیسے حیلوں بہانوں سے یہ خدائی پھر عوام پر مسلط کی جا رہی ہے۔

۲۔ عشق و مستی

دینِ طریقت کا پہلا زینہ عشقِ الٰہی قرار دیا گیا ہے، بلکہ صوفیاء ایمان کی تشریح ہی عشق و محبت سے کرتے ہیں (حدائق الاخیار، صادق فرغانی، ترجمہ بنام تلقین مرشدِ کامل، ص ۳۴۸) عشق عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن یہ لفظ عموماً بُرے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم یا احادیثِ صحیحہ میں کہیں بھی یہ لفظ مذکور نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے یا اس کے رسولِ اکرم ﷺ سے محبت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اس کے لئے حُبّ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ حتّٰی کہ قرآن کریم نے اسے سورۂ یوسف میں، جبکہ زلیخا کو واقعی حضرت یوسف علیہ السلام سے جنسی عشق تھا اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کیا اور اس کی جگہ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (یعنی محبت زلیخا کے دل کے پردے تک پہنچ گئی تھی یا گھر کر گئی تھی) کے الفاظ استعمال کئے۔ اس لئے کہ عشق کے لفظ سے غیر شعوری طور پر طبیعت فحاشی اور بہیمیت کی طرف مائل ہو جاتی ہے، لیکن دینِ طریقت کا مدار ہی 'عشق' پر ہے اور اس لفظ کو بڑے فخریہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ	(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو اگر تم خدا سے محبت
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳/۳۱)	چاہتے ہو، تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت رکھے گا۔

بتلایئے بھلا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا کون ہوسکتا ہے، لیکن یہاں بھی لفظ محبت ہی استعمال ہوا ہے مگر متصوفین اور شاعروں نے اس لفظ کا پروپیگنڈا اس رنگ میں کیا کہ یہ لفظ "ایمان" کا مترادف اور ایک بہت اچھی صفت قرار دیا گیا۔ مولانا روم، حافظ شیرازی اور علامہ اقبالؒ نے اس لفظ کو دوام بخشا۔ مثلاً علامہ اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر　　وہی قرآں، وہی فرقاں وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوتِ ایمانی کی تعریف بھی اس لفظ سے کی جارہی ہے اور اس کے مقابل عقل کو لاکھڑا کیا گیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اسی طرح عام مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کو بھی اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدہ عالم دوامِ ما (حافظ شیرازی)

ترجمہ: وہ شخص کبھی نہیں مرتا جس کا دل عشق سے زندہ ہے۔ صحیفۂ کائنات پر ہمارا دوام اسی عشق کی برکت سے ثبت ہوچکا ہے۔

عشق اور معرفتِ الٰہی

اب ہم دیکھیں گے کہ دینِ طریقت میں عشق کی مداخلت کیوں ضروری قرار دی گئی۔ ابنِ عربی جو ہمارے صوفیاء کے شیخِ اکبر ہیں۔ اس کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں:

"اللہ نے انسان کے وجود سے ایک دوسرے وجود کو، جو اسی کی شکل پر تھا، نکالا۔ اور اس کا نام عورت رکھا۔ یوں سمجھئے کہ عورت آدمی کا ظہور ہے۔ جب انسان عورت کی طرف جھکتا ہے، تو گویا اپنے نفس کی طرف شوق کرتا ہے اور عورت، جو آدمی کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر اپنے اصلی وطن کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اسی لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتیں زیادہ محبوب تھیں۔ پھر اللہ کی محبت جس مخلوق کے ساتھ زیادہ تھی۔ اللہ نے اس مخلوق کو اپنی شکل پر پیدا فرمایا اور فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ اللہ اور انسانوں میں کس قدر مناسبت ہے اور شکل و صورت کے لحاظ سے کس قدر ہم آہنگی ہے۔" (فصوص الحکم، ص ۲۱۶)

"پھر جس طرح عورت ہم شکل اور وطن ہونے کی وجہ سے مرد سے محبت کرتی ہے۔ اسی طرح انسان خدا سے محبت کرتا ہے اور جس طرح مَرد، اس کا جزو اور ہم شکل ہونے کی بناء پر عورت کی طرف مائل ہوتا اور محبت کرتا ہے۔ اسی طرح خدا بھی انسان کی طرف مائل ہوتا اور محبت کرتا ہے پس تین چیزیں سامنے آئیں۔ خدا، مَرد اور عورت۔ گویا جس طرح عورت کو مَرد کی کشش ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کو اپنے رب کی کشش ہوتی ہے" گویا کسی عورت کے ساتھ محبت بھرے الفاظ و اخلاق کو تخلقوا باخلاق اللہ کی منزل قرار دیا جا رہا ہے۔

عشقِ مجازی اور حقیقی کی تقسیم

آپ نے یہ بات تو صوفی لوگوں سے اکثر سنی ہو گی کہ عشقِ حقیقی کی ابتدا عشقِ مجازی یعنی عورت کے عشق سے ہوتی ہے۔ اس کے تحت میں بھی یہی فلسفہ کام کر رہا ہے۔ ابنِ عربی کا کہنا ہے کہ "جب مرد عورت سے محبت اور مجامعت کرتا ہے، تو یہ مشاہدہ حق کی اکمل ترین صُورت ہوتی ہے اور وہ عورت میں خُدا کا مشاہدہ کرتا ہے، یعنی عورت جو منفعل ہے، اس میں اس کو خدا نظر آرہا ہے اور ظاہر ہے کہ مادیات سے ہٹ کر خدا کا مشاہدہ تجریدی صُورت میں نہیں ہو سکتا۔" (فصوص الحکم، ص ۲۱۷)

عشقِ مجازی اور امرد پرستی

ابنِ عربی نے تو مشاہدۂ حق کے لئے عورت کا وجود ضروری سمجھا، خواہ کوئی عورت ہو، مگر دوسرے صُوفی اکثر اَمرَد یا بے ریش لڑکے کو پسند فرماتے ہیں۔ اس بارہ میں اُن کا ایک مقولہ بھی ہے، یعنی:

اَلنَّظْرُ اِلٰی وَجْہِ الْاَمْرَدِ عِبَادَۃٌ   یعنی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

چنانچہ شبلی خود بیان کرتے ہیں کہ "مجھے اس وقت تک سکون حاصل نہیں ہوتا، جب تک کسی بے ریش لڑکے کو نہ دیکھ لوں۔" (الطبقات الشعرانی، ص ۱۰۴)

اور یہی تیسری صدی کے صُوفی ابوبکر شبلی روایت کرتے ہیں کہ "میں نے ایک بار ابلیس کو دیکھ کر آواز دی، تو اس نے کہا، مجھے تجھ سے کچھ کام نہیں، میں تمہاری گمراہی سے فارغ ہو چکا ہوں۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے؟ ابلیس کہنے لگا، تم نوخیز لڑکوں کے ساتھ محبت کرتے ہو؟" شبلی نے بیان کیا کہ واقعتاً یہ ایسی چیز ہے جس سے کوئی صوفی محفوظ رہا ہو؟" (الطبقات الشعرانی، ص ۱۰۴)

اللہ تعالیٰ پر الزام

اب صُوفی عبدالغنی نابلسی کے عشقِ مجازی کے متعلق ارشادات ملاحظہ فرمائیے:

اِلٰہِیۡ لَیۡسَ لِلۡعُشَّاقِ ذَنۡبٌ لِاَنَّکَ اَنۡتَ تَبۡلِی الۡعَاشِقِیۡنَا

اے میرے خدا! عاشقوں کا کیا گناہ ہے، جبکہ تُو خود ہی عشاق کو عشق میں مبتلا کرتا ہے۔

وَ تَخۡلُقُ کُلَّ ذِیۡ وَجۡہٍ جَمِیۡلٍ تَکَادُ لَہٗ تُصَلِّی الۡعَابِدِیۡنَا

اور تو ہی خوبصورت چہروں کا خالق ہے۔ جن کی خوبصورتی کی وجہ سے عبادت گزار ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

وَ تَاۡمُرُنَا بِغَضِّ الۡبَصَرِ مِنۡہُمۡ کَاَنَّکَ مَا خَلَقۡتَ لَنَا عُیُوۡنَا

پھر ہمیں حکم دیتا ہے کہ ان سے نگاہیں نیچی رکھیں، کیا تو نے اُن کو دیکھنے کے لئے ہمیں آنکھیں عطا نہیں کیں۔ (الفتح الربانی للفیض الرحمانی، ص ۲۷)

یہ اشعار محض شاعرانہ تصوّرات نہیں، بلکہ عشقِ مجازی، حقیقی اور معرفت کی جان ہیں، جو ایک صاحبِ حال متصوّف نے کہے ہیں۔

عشقِ مجازی کے فضائل

بعد میں عشقِ مجازی کا یہ نظریہ آہستہ آہستہ دینِ طریقت کی بنیاد قرار پا گیا۔ عارف جامی فرماتے ہیں:

متاب از عشق او گرچہ مجازی ست کہ آں بہرِ حقیقت کارسازی ست

ترجمہ: عشق سے روگردانی نہ کر اگرچہ وہ مجازی ہو۔ کہ یہ حقیقت (عشقِ حقیقی) کے لئے ایک حیلہ ہے۔

اور اس سلسلہ میں ایک موضوع حدیث بھی پیش کی جاتی ہے:

مَنۡ عَشِقَ فَعَفَّ وَکَتَمَ فَمَاتَ مَاتَ شَہِیۡدًا

جو شخص کسی پر عاشق ہو جائے، پھر عفیف رہے اور پوشیدہ رکھے، پھر مر جائے، تو وہ شہید مرے گا۔ (تجدید تصوف و سلوک ص ۳۱)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب یہ حدیث درج کرنے کے بعد اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "یہ عشق غیر اختیاری ہوا (خود پیدا کردہ نہ ہو) پھر اس کی بات کسی سے نہ کرے، نہ کسی سے اُس کی بات سُنے نہ ہی دل میں اس کا خیال لائے۔" سوال یہ ہے کہ وہ عشق ہی کیا ہوا جس کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ آگے چل کر تھانوی صاحب لکھتے ہیں:

"اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو عشقِ مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے اس سے عشقِ حلال (مثلاً بی بی سے) مراد ہے نہ کہ حرام (ایضاً ص ۱۴۰)

غور فرمائیے! اپنی بی بی سے پیار و محبت کرنے کو کوئی ان اصطلاحی معنوں میں عشق کہتا ہے؛ بی بی سے پیار و محبت تو ایک فطری داعیہ اور منصوص طریقہ ہے، جس کی خود اللہ تعالیٰ نے تلقین کی ہے۔ اُس کا عشقِ مجازی سے کیا تعلق؛ غرض مجدد صاحب موصوف اپنے اکابر کے اس مسئلہ پر بڑے اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر اس عشق مجازی کا فائدہ یہ بتلاتے ہیں کہ جب قلب کا انجن گرم ہو جائے، تو پھر اس کا رُخ عشقِ الٰہی کی طرف بآسانی موڑا جا سکتا ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عشق ہی کیا جس کا رُخ موڑنا اپنے بس میں ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ صُوفیاء کے دِل کی گرمی اور سوز وہ گوہرِ نایاب ہے، جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے۔ تصوف کے سینہ بہ سینہ ہونے کے یہی معنی ہیں (ص ۱۴۱) گویا آپ نے پوری طرح اعتراف کر لیا کہ تصوف کا اصل جوہر دِل کی گرمی ہے، جو عشقِ مجازی سے پیدا ہوتی ہے۔

عاشقِ الٰہی کا جنازہ یا عرشِ الٰہی؟

عشق کے منجملہ فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عاشقِ الٰہی کا جنازہ فی الحقیقت عرشِ الٰہی ہی ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ:

"ابو موسےٰ کہتے ہیں کہ رات میں نے خواب دیکھا کہ عرشِ الٰہی سر پر اُٹھائے اُڑ رہا ہوں۔ اس خواب سے سخت متعجب ہوا اور اس کی تعبیر پوچھنے کے لئے بایزید بسطامی کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے اور بے شمار مخلوق ہر طرف سے جمع ہو رہی ہے۔ جنازہ اٹھایا گیا، تو میں نے چاہا کہ اسے کندھا دوں، مگر کثرتِ ہجوم کی وجہ سے میری باری نہ آتی تھی۔ بالآخر جنازہ کے نیچے گھس کر اُسے اپنے سر پر اٹھا لیا، تو ناگہاں اس وقت کیا سنتا ہوں کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ "اے ابو موسےٰ! یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے۔ وہ عرشِ الٰہی تو یہی عاشقِ الٰہی کا جنازہ ہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۹۵)

اس لحاظ سے جتنے عاشقانِ الٰہی اس طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ انہیں بھی اور ان کے سینوں کو بھی عرشِ الٰہی ہی سمجھا جاتا ہے۔

اس عشق کی گرمی سے متعلق بھی صوفیاء میں درج ذیل مقولہ زبانِ زدِ خاص و عام ہے:

اَلْعِشْقُ نَارٌ یُحْرِقُ مَا سِوَی اللّٰہِ — عشق ایک ایسی آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتی ہے

پھر اس مقولہ کی عملی تفسیر و تعبیر جو پیرانِ پیر نے واقعاتی دنیا میں پیش فرمائی، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

العِشقُ نارٌ کی عملی تعبیر

صاحب "مناقبِ غوثیہ" حضرت شیخ محمد صادق شیبانی فرماتے ہیں: "ایک روز میں غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے اپنے ایک خادم سے کہا: "سید احمد رفاعی (م ۵۷۲ھ) کے پاس جا اور پوچھ کہ عشق کیا ہے، اور اس کا جواب مجھے لاکر دے۔ خادم ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کا پیغام دیا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ایک آہِ جاں کاہ اپنے سینہ پُرسوز سے کھینچی اور کہا کہ عشق ایسی آگ ہے، جو ماسوا اللہ کو جلا ڈالتی ہے۔ ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے ہوئے تھے وہ جل اُٹھا اور سید احمد رفاعی بھی اُس کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گئے۔ پھر وہی راکھ پانی ہو کر برف کی مانند جم گئی۔ خادم خوفزدہ ہو کر خدمتِ غوث الاعظم میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا بیان کیا۔ فرمایا: پھر اُسی جگہ جا اور اس کو بخور اور عطر سے معطر کر، جسم سید احمد کا اس عالم عنصری کی طرف عود کرے گا۔ چنانچہ خادم اسی جگہ واپس آیا۔ اس جگہ کو معطر کیا تو جو پانی سید احمد کی جگہ جما ہوا تھا۔ اس نے جسم کی صورت اختیار کر لی اور سید احمد دوبارہ زندہ ہو گئے۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۷۱)

یہ قصہ تو بہت اچھا ہے مگر یہ سمجھ نہیں آئی کہ:

۱۔ عشق کی اس آگ سے سید رفاعی بھی جل کر خاکستر ہوئے اور درخت بھی۔ مگر پاس کھڑا خادم صحیح و سلامت بچ گیا، کیا وہ ماسوا اللہ نہیں تھا۔؟

۲۔ عشق کا کام تو ماسوا اللہ کو جلا ڈالنا ہے۔ پھر اسے پانی اور پھر برف میں تبدیل کرنا نہیں۔ پھر یہ عمل اکیلے سید رفاعی پر ہوا۔ درخت پر نہیں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایسے عشق کے جلے ہوتے لوگوں کا علاج بخور اور عطر ہوتا ہے۔

بہر حال صادق شیبانی صاحب کی داد دیجئے کہ انہوں نے العشق نارٌ یحرق ما سوا اللہ کی عملی تعبیر پیش کر دی۔

اِن اولیاء اللہ نے ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق عشقِ مجازی کے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ ان میں چند ایک کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ اس سے پہلے ہم حکیم سرمد دہلوی کا ذکر پہلے باب میں کر چکے ہیں کہ وہ کس طرح ایک ہندو لونڈے پر عاشق ہوئے۔ اس کے عشق میں دیوانہ ہو گئے، تو انہیں "مجذوب" کا مقدس لقب مل گیا تھا۔

شیخ حسین لاہوری (م ۱۰۵۲ھ) کا عشق

بہلول دریائی (م ۹۸۳ھ) کے خلیفہ تھے۔ ۳۶ سال ویرانے میں ریاضت و مجاہدہ کیا۔ رات کو داتا گنج بخش کے مزار پر اعتکاف میں بیٹھتے۔ آپ نے طریقہ ملامتیہ اختیار کر لیا۔ دارا شکوہ نے انہیں ملامتیوں کے گروہ کا سردار لکھا ہے۔ چار ابرو کا صفایا۔ ہاتھ میں شراب کا پیالہ، سرود و نغمہ، چنگ و رباب، تمام قیودِ شرعی سے آزاد، جس طرف چاہتے، نکل جاتے۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۱۸)

"روایت ہے کہ ایک شخص حاجی یعقوب نامی مدینہ منورہ کا رہنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ شیخ حسین کو روضۂ نبوی میں معتکف دیکھتا۔ وہ ایک مرتبہ لاہور آیا، تو ایک جگہ بازار میں دیکھا کہ ڈھول بج رہا ہے اور شیخ شراب کے نشہ میں چور رقص کر رہا ہے۔ دیکھ کر شیخ حسین کو پہچان لیا، مگر سخت حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ شیخ نے کہا "آنکھیں بند کرو۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہی اپنے آپ کو مدینہ منورہ میں اور حسین کو روضۂ نبوی میں معتکف پایا۔" (ایضاً، ص ۲۲۱)

"نقل ہے کہ حسین کے دشمنوں نے اکبر بادشاہ سے شکایت کی کہ "لاہور میں ایک شیخ حسین نامی ہے، داڑھی مونچھیں منڈواتا ہے۔ سُرخ لباس پہنتا ہے اور کھلے بندوں خلافِ شریعت امور کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک حسین لڑکے مادھو کو اپنے پاس رکھتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈھول کی آواز پر رقص کرتا ہے۔ اس کے باوجود باطنی ولایت کا دعویدار بھی ہے۔ بادشاہ نے اسے بلایا، تو حسین اسی طرح مست و مخمور جام و صراحی لئے دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر نے کہا "تو سلسلہ قادریہ کا پیرو ہو کر یہ مے نوشی اور امرد پرستی کیوں کرتا ہے؟" اس کے جواب میں حسین نے اپنی صراحی سے ایک پیالہ اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے دیکھا وہ سرد پانی تھا۔ دوسرا پیالہ پیش کیا، تو وہ شربت سے پُر تھا۔ اسی طرح تیسرا پیالہ دودھ سے۔ اکبر سخت حیران ہوا اور بغرض امتحان جیل بھجوا دیا کہ اگر صاحب کرامت ہے، تو زنداں میں نہیں رہ سکتا۔ اکبر جب اسے جیل بھجوا کر زنان خانہ میں گیا، تو شیخ حسین کو بادشاہ بیگم کے پاس کھڑا دیکھا۔ پھر قید خانہ میں گیا، تو حسین کو وہاں بھی موجود پایا۔ یہ دیکھ کر اکبر نے اسے رہا کر دیا۔" (ایضاً، ص ۲۲۲)

"صاحب حقیقت الفقراء لکھتے ہیں کہ شیخ حسین کے مُرید نو ہزار کے قریب تھے، جو ان کے ذریعے کامل و اکمل ہوئے۔ بعض نے شیخ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار لکھی ہے۔ ان میں سے سولہ خلفا

زیادہ مشہور ہوتے۔ ان میں سے چار کا خطاب غریب ہے، چار کا دیوان، چار کا خاکی اور چار کا بلاول۔
دیوان یہ ہیں:

"پہلا دیوان مادھو۔ (مادھولال ہندو لڑکا، جو آپ کا معشوق تھا، ولی کامل ہوا۔ اور آپ کے ساتھ لاہور میں مدفون ہے) دوسرا دیوان گورکھ، تیسرا دیوان بخش، چوتھا اللہ دیوان، لاہور میں مدفون ہے۔"
(ایضاً ۲۲۳)

"جب تک کوئی شخص داڑھی مونچھ کا صفایا نہ کرا دیتا، اس وقت مرید نہ سمجھا جاتا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مرید کو شراب کا پیالہ دیتے، اگر وہ پی لیتا، تو مریدوں میں سمجھا جاتا (گویا یہی اس کی بیعت تھی) ورنہ مجلس سے باہر نکال دیا جاتا۔ ان ظاہری بدعتوں اور خلافِ شریعت باتوں کے باوجود ولی سمجھے جاتے تھے..... داراشکوہ نے "حسنات العارفین" میں اُن کی بڑی تعریف کی اور ایک دو کرامتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ اپنی تصنیف "شطحیات" میں لکھتا ہے کہ "شہزادہ سلیم اور اکبر کی اکثر بیگمات اس کی عقیدت مند تھیں، سلیم نے خاص کر ایک درباری بہار خان نامی کو مقرر کر رکھا تھا، جو اُن کا روزنامچہ لکھتا رہے۔ اور یہ روزنامچہ رسالہ بہاریہ کے نام سے مشہور ہے۔" (ایضاً، ص ۲۱۸ کا حاشیہ)

ذکر معشوق شیخ مادھو لاہوری

"شیخ مادھو حسین لاہوری کے خلفائے ارجمند اور محبوبانِ دلپسند میں شمار ہوتے ہیں۔ شاہدرہ کے ایک برہمن کے لڑکے تھے۔ بڑے صاحبِ جمال اور خوش شکل تھے۔ ایک دِن گھوڑے پر سوار جا رہے تھے کہ شیخ حسین کا دِل موہ لیا۔ بس پھر کیا تھا، شیخ حسین لاہور چھوڑ کر شاہدرہ میں آگئے۔ ساری رات مادھو کے مکان کا طواف کرتے اور ان کے متعلق جہاں سے خبر ملتی کہ مادھولال فلاں جگہ ہے، وہاں چلے جاتے۔ اِن حالات نے شاہ حسین کے عشق کو زمانہ میں مشہور کر دیا۔ آخر اس عشق کے اثرات مادھولال کے دِل پر وارد ہونے لگے اور وہ بھی شیخ حسین کے پاس آنے لگا۔ والدین آڑے آئے مگر بے سود۔ آخر مادھو سے کہنے لگے۔ ہم گنگا اشنان کرنے جا رہے ہیں، تم بھی ہمارے پاس چلو۔ مادھولال، شیخ حسین کے پاس اجازت کے لئے گیا، تو شیخ حسین نے کہا۔ والدین سے کہہ دو۔ "تم جاؤ۔ بوقتِ غسل میں موجود ہوں گا۔" مادھولال اس کرامت کے مظاہرہ کے لئے لاہور رہ گئے۔ جب غسل کا وقت تھا، تو شیخ حسین نے مادھولال سے کہا "آنکھیں بند کر کے میرے قدم پر قدم رکھتے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد شیخ حسین نے کہا، اب آنکھیں کھول لو۔

مادھو نے دیکھا کہ وہ دریائے گنگا میں اپنے والدین کے ساتھ غسل کر رہے ہیں اور شاہ حسین بھی کنارے پر موجود ہیں۔ مادھو والدین سے ملاقات کے بعد اسی طرح شیخ حسین کے قدم پر قدم رکھ کر واپس لاہور پہنچ گئے اور مسلمان ہو گئے۔ دو ماہ بعد ہولی اور بسنت کے تہوار آئے، تو شیخ حسین نے مادھو لال کی دلجوئی کے لئے مجلس سماع وسرود منعقد کی اور عالم مستی میں ایک دوسرے پر بسنتی رنگ پھینکا، چنانچہ تاحال یہ رسم جاری ہے اور شیخ حسین کے معتقدین آپ کے مزار پر گلابی رنگ پھینکتے ہیں۔ اس مجلس میں مادھو لال شیخ حسین کی بیعت ہوا اور شیخ کی نگاہِ کیمیا اثر نے مادھو لال کو کمالاتِ فقر پر پہنچا دیا۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۵۰، ۲۵۱)

مادھو لال حسین کے عشق کی داستان ہم نے ذرا تفصیل سے اس لئے لکھی ہے کہ اس سے مروجہ ولایت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ ایسا بے دین، اَمرد پرست اور کبائر کا مرتکب بھی ولی ہو سکتا ہے اور ایک نگاہِ کیمیا اثر سے کمالاتِ فقر تک پہنچا سکتا ہے۔ یعنی کمالات کا معنیٰ شعبدہ بازیاں اور ولی بمعنی شعبدہ باز۔

۲۔ ایسے اولیاء اللہ بھی تذکروں کی زینت اور قابلِ احترام قدس سرہٗ سمجھے جاتے ہیں۔

۳۔ ولایت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ مادھو لال کا کم از کم نام ہی تبدیل کر دیا جاتا۔

۴۔ جو لوگ ان اولیاء کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ دراصل شعبدہ بازیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اسلام انہیں بھی پسند ہے۔

تاج محمود قادری نوشاہی

صاحبِ تذکرہ نوشاہی آپ کے صاحبزادے شیخ آفتاب کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ایک روز شیخ محمود بحالت سکر و استغراق کنوئیں پر بیٹھے تھے کہ ایک نئی دُلہن کی ڈولی ادھر سے گزری، آپ چونکہ حسن پرست اور عشق پرست تھے۔ اس ڈولی کے پاس جا کر اس سے کہا کہ " اس ڈولی کا پردہ اٹھا، تاکہ میں صانع حقیقی کا جلوہ اس آئینہ قدرت میں دیکھوں۔" دُلہا یہ سُن کر بڑے غصہ میں آیا اور بدکلامی سے مخاطب ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی راہ طے کی تھی کہ دلہن خود بخود دیوانہ وار نکل آئی اور زمین پر تڑپنے لوٹنے لگی اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا شوہر بے حد پریشان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ " جاؤ! تمہاری دلہن اب اصلی حالت پر آگئی ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۸۵)

دیکھا آپ نے کس طرح ان اولیاء اللہ کے ہاتھوں قرآن کے احکامِ پردہ کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ ایسے شعبدہ بازوں کو بھی تذکرہ نگار قدس سرہٗ کے القاب سے نوازتے اور ان کی داستانوں کو اپنے تذکروں کی زینت بناتے ہیں اور یہ اولیاء اللہ خود ہی مجرم نہیں ہوتے، بلکہ شعبدہ بازیاں دکھلا کر دوسروں کو اپنا معتقد بناتے اور اپنی بے ہودگیوں کے لئے راہ ہموار کرتے پھرتے ہیں۔

حاجی محمد قادری نوشاہی

"مشہور یہ ہے کہ حضرت نوشاہ قوم گلگو (کہار) سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ قوم کھکر (کھوکھر) سے تھے۔ اس قوم (گلگو، کہار) سے مشہور ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے بزرگوں میں سے کوئی بزرگ اس قوم (گلگو، کہار) کی ایک حسین و جمیل لڑکی پر عاشق ہو گئے تھے اور اس کے عشق میں ایسے خود رفتہ ہوئے تھے کہ اسی قوم کے طور طریقے اختیار کر لئے۔ آخر یہ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی میں تبدیل ہو گیا اور آپ زمرۂ اولیاء میں آ گئے۔" (خزینۃ الاولیاء، ص ۲۶۹)

ہمارے خیال میں زمرۂ اولیاء میں شامل ہونے کا یہ نسخہ بڑا دل لگتا بھی ہے، آسان بھی اور بہترین بھی۔

میاں شیر محمد شرقپوری (م ۱۳۴۱ھ)

آپ قطبُ العالم، غوثِ ربانی، بشیرِ یزدانی اور مادر زاد ولی تھے۔ خزینۂ معرفت کا مصنف بیان کرتا ہے کہ "ایک مرتبہ آپ کو ایک نوعمر لڑکے غلام محمد کٹاریہ سے محبت ہو گئی۔ اس کے عشق میں اس درجہ محویت ہوئی کہ آپ ہر وقت اسے یاد کرتے رہتے۔ جب اسے نہ پاتے، تو بے چین ہو کر اسے ڈھونڈنے نکل جاتے اور تلاش کر کے لاتے اور جب کبھی وہ چلا جاتا، تو اکثر فرماتے۔ ادھر عشق ستا رہا ہے اُدھر غلام محمد یاد آ رہا ہے۔ بہت عرصہ دراز تک میاں صاحب اس نوجوان کے عشق میں مبتلا رہے اور آہ و فغاں کرتے رہے۔ پھر کافی مدت بعد آہستہ آہستہ اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رہا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۳۶۵)

ان واقعات سے آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگرچہ یہ اولیاء اللہ غیر محرم عورتوں سے بھی عشق فرماتے ہیں، تاہم لونڈوں کو زیادہ پسند فرماتے ہیں اور اگر کوئی لڑکا ہندو بھی ہو، تو پھر عشقِ مجازی اپنی پوری بہار دکھلاتا ہے اور یہ سب کام متبرک اس لئے ہے کہ یہ عقیدہ بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ عشقِ مجازی ہی عشقِ حقیقی یا معرفت کا پہلا زینہ ہے۔ پھر ان لوگوں نے عشقِ مجازی کی آڑ میں حیوانات کو بھی نہ چھوڑا۔

عشق مجازی اور حیوانات

ان صُوفیوں میں ایک صُوفی "سیّد علی وحیش" ہیں وہ کسی کو گدھی پر سوار دیکھتے، تو اُنہ نے کا حکم دیتے اور کہتے کہ اس کا سر تھام رکھ تاکہ میں اس سے بدفعلی کروں۔ اگر وہ انکار کرتا تو زمین سے چمٹ جاتے اور وہ ایک قدم نہ چل سکتا سوا بیچارا مجبوراً یا تو ایک طرف نظر کر لیتا یا پھر یہ نظارا قہراً برداشت کرتا۔ جبکہ دوسرے لوگ پاس سے گزر رہے ہوتے۔ (فضائح صوفیہ ، ص ۱۳۶ (عربی مطبوعہ کویت)

اب دیکھئے۔ یہ بزرگ وحیش تو اس لئے کہلائے کہ وحشی جانوروں سے صُحبت فرمایا کرتے تھے۔ تاہم صوفیاً کے طبقہ میں ان حضرت کی بزرگی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

پھر ان لوگوں کی مکاری ملاحظہ ہو۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ملامتیہ کہلانا شروع کر دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملامت سے بھی ان کے معرفت کے دروازے کُھلتے ہیں۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ (۲۷/۲۴)

اسی طرح کا ایک واقعہ تذکرہ غوثیہ میں بھی مذکور ہے، جو بلا تبصرہ حاضرِ خدمت ہے:

"فقیر صاحب نے فرمایا کہ بعد نمازِ عشاء ہماری روٹی مسجد میں لے آنا۔ جب ہم روٹی لے کر مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ میاں صاحب ایک گدھی سے مصروف ہیں۔ میں نے منہ پھیر لیا، پھر جو دیکھا تو نماز پڑھتے ہیں۔ بعد فراغت کھانا کھایا، باتیں کرنے لگے۔" (تذکرہ غوثیہ بحوالہ الانسان فی القرآن طبع اول، ص ۲۵۳ تا ۲۵۵)

واضح رہے کہ محولہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن سے یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

۳۔ جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر

صُوفیاء کا طبقہ ریاضت و مجاہدہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے درج ذیل حدیث کا سہارا لیتا ہے:

وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللهِ — مجاہدہ وہ ہے، جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

اس حدیث میں فی طاعۃ اللہ کے الفاظ صُوفیاء کے اس گمانِ باطل کو رد کرنے کے لئے کافی ہیں کیونکہ ان کے ریاضت و مجاہدہ میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو صریحاً کتاب و سنّت کے خلاف ہیں۔ ان کا مجاہدہ

نفس نہیں بلکہ نفس کشی ہوتی ہے اور فی معصیتہ اللہ ہوتی ہے اور اللہ کی اطاعت اور اس کا اسلامی نقطۂ نگاہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

پھر یہ حدیث بیہقی نے شعب الایمان میں فضالہ سے روایت کی ہے۔ جس کے پورے الفاظ یہ ہیں:

"اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کر دیا۔"

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جہاد اور ہجرت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس طرف ذہن عموماً منتقل نہیں ہوتا۔ بتلایا یہ گیا ہے کہ جہاد اور ہجرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے ورنہ جس طرح ہجرت وہی ہے۔ جو مسلمانوں نے فتح مکہ سے پہلے کی ہے یا ایسے حالات میں مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے لیے کریں۔ اسی طرح جہاد حقیقتاً وہی ہے جسے جہاد بالسیف کہا جاتا ہے اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جہاد بالسیف کی فضیلت

ارشادِ باری ہے:

لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقَاعِدِیْنَ دَرَجَةً (۴/۹۵)	جو مسلمان بغیر عذر کے گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کرتے ہیں، یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت بخشی ہے۔

اور امام بخاری نے کتاب الجہاد والسیر میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے:

اَفْضَلُ النَّاسِ مُؤْمِنٌ یُّجَاهِدُ بِنَفْسِهٖ وَ مَالِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ	سب لوگوں میں افضل وہ ہے، جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔

مولانا اللہ یار خاں صاحب نے کتاب الاذکار (محی الدین ابوزکریا نوری م ۶۷۶) میں سے دو احادیث ایسی نقل فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی ہر طرح کی جانی اور مالی عبادتوں حتیٰ کہ جہاد بالسیف سے بھی افضل ہے۔ پھر جو روایت ذکرِ الٰہی کو جہاد سے افضل قرار دیتی ہے۔ اتفاق سے اس پر ترمذی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور وہ روایت اس طرح ہے:

"حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیامت کے دِن اللہ کے

ہاں کونسی عبادت سب سے افضل ہوگی ؟ فرمایا " اللہ کو یاد کرنے والوں کا درجہ سب سے بلند ہوگا " میں نے عرض کیا، " کیا مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی ؟ " فرمایا " اگر مجاہد فی سبیل اللہ کفار اور مشرکین پر تلوار چلائے ، حتیٰ کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے لتھڑ جائے ، تو بھی اللہ کا ذکر کرنے والے افضل ہیں " (دلائل السلوک، ص ۱۰۷)

اب دیکھئے ذکرِ الٰہی کی انتہائی فضیلت سے ہمیں بھی انکار نہیں ، لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے ۔ یہ حدیث فی الواقع ترمذی ، کتاب الدعوات ، باب ماجاء فی فضل الذکر میں موجود ہے ۔ مگر امام ترمذی یہ حدیث درج کرنے کے بعد اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں " هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ اِنَّمَا نَعْرِفُهٗ مِنْ حَدِيْثِ دَرَّاجٍ " اب یہ تو واضح ہے کہ یہ تبصرہ چونکہ ان صوفیاء کے عقیدہ کے خلاف پڑتا تھا ، لہٰذا اسے عمداً درج نہیں کیا گیا ۔

دوسری حدیث جس میں ذکرِ الٰہی کو تمام جانی اور مالی عبادتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے ۔ اس کا صاحب کتابُ الاذکار نے حوالہ درج ہی نہیں فرمایا ۔ یا پھر شاید مولانا اللہ یار خان چھوڑ گئے ہوں ۔

پھر صوفیاء نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ جہاد بالنفس کو مجاہد بالسیف کے مثل قرار دیں ، بلکہ ریاضت و مجاہدہ کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے ایک وضعی حدیث بھی پیش کر دی اور نعرہ لگایا کہ :

صوفیاء کی موضوع حدیث

رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ   ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آتے ہیں ۔

حسین احمد مدنیؒ کہتے ہیں ، صوفیاء اس کو صحیح حدیث کہتے ہیں ، لیکن امام عسقلانی کا قول ہے کہ امام نسائیؒ نے اسے ابراہیم بن عبلہ کا کلام بتایا ہے ۔ الفاظ کی رکاکت زبردست قرینہ ہے کہ یہ آں حضرت ﷺ کا قول نہیں ہو سکتا اور نہ حدیث کی کتابوں میں شاہ عبدالعزیز جیسے متبحر محدّث نے دیکھا ہے ۔ پس احادیث کا فیصلہ محدّثین کے اصول و قواعد کی رُو سے کیا جائے گا ۔ بیچارے صوفیاء جن پر حسنِ ظن کا غلبہ ہوتا ہے ، ان حضرات کو تنقید و تفتیش کی فرصت کہاں ؟ اِن کے حسنِ ظن سے کسی قول کا حدیثِ رسول ہونا ثابت نہیں ہو جائے گا ۔ " (مکتوباتِ شیخ الاسلام ، ص ۳۰۷ ، ۳۰۸ ، ج ۱ ، بحوالہ اسلامی تصوف ، یوسف سلیم چشتی ، ص ۱۲۳)

عبدالکریم جیلی کا فلسفۂ جہاد

عبدالکریم جیلی اس مجاہدۂ نفس کے " جہادِ اکبر " ہونے کی توجیہہ پیش فرماتے ہوئے لکھتا ہے :

"نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ بخار ہر مومن کا آگ سے حصہ ہے۔ جب بخار آگ کا قائم مقام ہو سکتا ہے، تو کیا مجاہدات، ریاضات، مخالفات، جن سے تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے اور جن میں ہر تکلیف سے بڑھ کر تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، دوزخ کی آگ کا قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجاہدات کا نام جہادِ اکبر رکھا ہے اور تلوار کے جہاد کا نام جہادِ اصغر ہے اور اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ بخار بمقابلہ دشمن سے لڑنے مارنے اور نیزہ لگانے وغیرہ سے زیادہ آسان ہے اور یہ تمام جہادِ اصغر ہے۔ ان مجاہدات و مخالفات کی سختیوں کے مقابلہ میں جن کو اہل اللہ اُٹھاتے ہیں۔"

(انسانِ کامل، ص ۳۰۲)

عبدالکریم جیلی کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان صوفیاء کے مجاہدہ و ریاضت اور مخالفتِ نفس یہ بدعیہ طریقے، جہاد بالسیف کے مثل یا اس سے افضل تو درکنار، الٹا اللہ کی معصیت اور گمراہی کا سبب ضرور بن سکتے ہیں، کیونکہ یہ سنتِ رسُول کے خلاف ہیں۔

پھر ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ:

"شہادت کی دو قسمیں ہیں، شہادتِ کبریٰ اور شہادت صغریٰ۔ شہادتِ صغریٰ کی چند قسمیں ہیں۔ اور حدیث اس کے متعلق وارد ہو چکی ہے کہ جو شخص مسافرت میں یا ڈوب کر یا دستوں وغیرہ کی بیماری سے مر گیا، وہ شہید ہے اور شہادتِ صغریٰ کا اعلیٰ درجہ جہاد فی سبیل اللہ میں قتل ہو جانا ہے اور شہادتِ کُبریٰ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ۔ اعلیٰ یہ ہے کہ عین الیقین سے تمام مخلوقات میں حق کا شہود ہو۔ مثلاً مخلوقات میں سے جب کوئی چیز دیکھے، تو اس شے میں بدوں حلول و انفصال و انصال حق کو مشاہدہ کرے، بلکہ حق کا شہود ایسا ہو جیسا کہ حق سبحانہٗ وتعالےٰ نے اپنے قول میں خبر دی ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ۔ اس کی شرطوں میں سے ایک شرط بدوں مستی وکیف کے دوام مراقبہ ہے۔ جب یہ شہود بندہ کے لئے صحیح ہو گیا، تو پھر وہ اللہ تعالےٰ کو مشاہدہ کرنے والا ہے۔ یہ شہادت کا اعلیٰ منظر ہے۔ اور ادنیٰ قسم بدوں کسی علت (یعنی دوزخ کا خوف یا جنّت کی حرص) کے محبّتِ الٰہی کا انعقاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کی محبّت اس کی صفات کے لئے ہو اور اس وجہ سے ہو کہ وہی محبّت کرنے کے لائق ہے۔" (انسان کامل، ص ۴۳۸)

دیکھا اس اقتباس کی رُو سے صُوفیاء کا یہ اعتقاد کیسے کھُل کر سامنے آگیا۔ جہاد بالسیف کو وہ شہادت

ادنیٰ کی اچھی قسم قرار دے رہے ہیں۔ رہی شہادتِ اعلیٰ، تو ان کے خود ساختہ طور طریقے، ریاضیات و فلسفہ اور اس کی اصطلاحات ہیں جن کا شریعت نبویہ میں کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔

صُوفیہ کے اس گوشۂ نشینی کے نظریہ نے مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا شاید ہی کسی اور وجہ سے پہنچا ہو۔ اس نظریہ نے مسلمانوں سے جہاد کی رُوح کو ختم کر کے دنیا میں ذلیل اور رُسوا قوم بنا دیا اور ایسے افعال سے مجاہدہ نفس شروع کیا جس سے انسانیت کو بھی شرم آنے لگے اور ان کی یہ تعلیم پوری قوم کے لئے مارفیا کے انجکشن کی حیثیت رکھتی ہے

دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اس نظریہ نے مسلمانوں کو اس قدر مفلوج، کاہل اور بے فہم بنا دیا تھا کہ وہ فرانسیسی فاتحین کے حملوں کا دفاع جامعہ ازہر میں بیٹھ کر اوراد و وظائف سے کر رہے تھے۔ نابلیون کا انتخاب کر کے اسے صوفیاء کی گودڑی پہنائی گئی اور اس کی رہنمائی میں ذکر و فکر کی مجالس قائم کی گئیں۔ بخاری شریف کا ختم بھی کرایا گیا، لیکن ان سب باتوں کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اور مسلمان مار کھاتے رہے۔ بالآخر جب مسلمان مجاہدین نے یورپ کی سرزمین میں لوگوں سے جنگیں کیں۔ تب جا کر حالات نے پلٹا کھایا۔ (مقدمہ " الفکر الصُوفی" ص ۶۔ از عبدالرحمٰن عبدالخالق، مطبوعہ کویت)

اس گوشہ نشینی کا جو اثر ان صوفیاء کی ذات پر مرتب ہوتا ہے، وہ ابو بکر شبلی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

" روایت ہے کہ کچھ عرصہ شبلی اپنے مقام سے غائب رہے۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہ چلا۔ ایک روز مخنثوں کے گروہ میں دیکھے گئے۔ لوگوں نے پوچھا: "اے شیخ! یہ کیا بات ہے؟" فرمایا: "یہ گروہ دنیا میں نہ مرد ہے نہ عورت۔ میں بھی اسی حالت میں گرفتار ہوں، نہ مرد ہوں نہ عورت۔ پس ناچار میری جگہ انہی میں ہے۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۷)

جنید بغدادیؒ کے مُرید اور جہاد بالسیف

ابو بکر شبلی کے پیر و مرشد جنید بغدادی کے مریدوں کو ایک دفعہ جہاد بالسیف کا شوق چرایا۔ یہ داستان اس طرح ہے کہ:

"شیخ جنید کے آٹھ مُرید تھے جو سب کے سب کامل و اکمل تھے۔ ایک روز انہوں نے خدمتِ شیخ میں عرض کی کہ اے شیخ شہادت ایک عجیب نعمتِ جانفزا ہے، اسے حاصل کرنا چاہیے۔ شیخ نے ان کی تائید کی اور اُن کے ساتھ ملکِ روم کی طرف جہاد کے لئے چل پڑے۔ ایک جگہ کفار سے مقابلہ ہو گیا ایک جگر

(آتش پرست) کے ہاتھوں شیخ کے آٹھوں مرید ایک ایک کر کے شہید ہوگئے۔ شیخ فرماتے ہیں: "میں نے اس وقت ہوا میں نو کجاوے معلق دیکھے۔ میرے ساتھیوں میں سے جو شہید ہوتا تھا، اس کی رُوح ایک کجاوے میں رکھتے اور آسمان کی طرف لے جاتے۔ آخر ایک کجاوہ باقی رہ گیا۔ میں سمجھا یہ میرے لئے ہے۔ اور جنگ میں مشغول ہوگیا۔ دورانِ جنگ وہی گبر جس نے میرے ساتھیوں کو شہید کیا تھا۔ میرے پاس آیا اور کہا، "ابوالقاسم! یہ آخری کجاوہ میرے لئے ہے۔ تو واپس بغداد چلا جا۔ اپنی قوم کی قیادت وسیادت کر اور اپنا مذہب میرے سامنے پیش کر۔ میں نے اسے تلقینِ اسلام کی وہ مسلمان ہوا اور کفار سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس آخری کجاوے میں اس کی رُوح کو آسمان کی طرف لے گئے ہیں۔" (خزینۃ الاصفیا ص۱۴۲)

اس روایت سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداءً ایمان کا یہ معیار بتلایا تھا کہ ایک مومن دس کافروں پر غالب ہونا چاہئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف فرما کر یہ معیار مقرر کیا تھا کہ ایک مومن کم از کم دو کافروں پر ضرور بھاری ہونا چاہئے مگر یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ شیخ جنید کے آٹھ کامل و اکمل مرید ایک کافر کے ہاتھوں شہید ہو رہے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر شہادت کا اتنا ہی شوق زیادہ تھا، تو بیس پچیس کافروں کو مار کر خود شہید ہوتے، مگر یہ سب ایک کافر کے ہاتھوں یوں مارے جا رہے ہیں جیسے قصاب بکروں کو ذبح کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ معیار کے مطابق ان میں ایمان کا جتنا حصہ تھا وہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔ یہی وہ قباحت ہے جس کی بناء پر اسلام نے رہبانیت یا طریقت کو مذموم قرار دیا۔

۲۔ شیخ جنید کو خود اپنی شہادت کا خطرہ بھی لاحق ہو چلا تھا، وہ تو خیریت گزری کہ اس گبر کا "نورِ فراست" شیخ جنید کے "نورِ فراست" سے زیادہ تھا اور اس گبر کو شیخ جنید سے پہلے معلوم ہوگیا کہ نواں کجاوہ جنید کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

۳۔ اسلام لانے کا یہ بھی کیسا انوکھا طریقہ ہے کہ کافر خود کسی مسلمان کو کہے کہ "میرے سامنے اسلام پیش کرتا کہ میں اسلام لاؤں"۔ بہر حال ولایت کی دنیا الگ ہے اور بمصداق ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

یہ بات بھی تسلیم کر ہی لینا چاہئے۔

۴۔ البتہ یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ روم تو سارا عہد فاروقی اور عثمانی میں فتح ہو چکا تھا اور شیخ جنید کے زمانہ

میں بغداد سے لے کر رُوم تک کا سارا علاقہ اسلامی مملکت میں شامل تھا۔ رُوم کے راستے میں ان کو کس کا لشکر ملا کہاں تھا؟

بہر حال اس راوی کی داد ضرور دینا چاہیئے جس نے اس قصہ میں اولیاء اللہ کی کرامات سمو کر یہ لاجواب شاہکار تراشا ہے۔

گوشہ نشینی کا ردّ

اسلام نے ہمیں مل جل کر رہنے سہنے، معاشرتی زندگی گزارنے، خانہ داری اور کسبِ حلال کے آداب و احکام سکھلائے ہیں لیکن صوفیاً اپنا سارا زور ترکِ دنیا، خود کسب کرنے اور عائلی زندگی سے فرار پر صرف کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھی جاتی ہیں۔ تاہم صوفیاء میں سے ہی کچھ ایسے بزرگ بھی ہیں، جنہوں نے اس بنیادی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسے واقعات انہی تذکروں میں کہیں نہ کہیں نظر آجاتے ہیں مثلاً:

ابراہیم ادہم پہلے بلخ کے بادشاہ تھے۔ ان کے بادشاہی چھوڑ کر فقر اختیار کرنے کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ انہوں نے خود تو ترکِ دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی مگر ایک شخص کے سوال کرنے پر وہ جواب یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے چاہا کہ وہ بھی اہل و عیال چھوڑ کر ابراہیمؒ کی طرح عبادت گزار بن جائے آپ نے سنا تو فرمایا: "واللہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہ پریشانی اور فکر جو اہل و عیال کی خبر گیری میں ہے میری عبادت سے بڑھ کر فضیلت رکھتی ہے، تو وہ یہ خواہش ہرگز نہ کرتا۔" اتنے میں ایک اور عیالدار شخص جسے ایک دن کوئی مزدوری نہ ملی تھی، فکر و غم میں جا رہا تھا کہ بچوں کو کیا کھلائے گا۔ راستہ میں حضرت ابراہیمؒ کو بے فکر بیٹھے ہوئے دیکھا اور کہنے لگا "مجھے آپ پر رشک آتا ہے، آپ غمِ عیال سے فارغ بیٹھے ہیں۔" آپ نے فرمایا "بھئی! مجھے تو آج کے غم کا ثواب دے دے۔ بخدا میں اپنی ساری عمر کا ثواب تجھے دیتا ہوں۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک تیرا غمِ عیال میری عبادت سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔" یہ سن کر اُس کا دِل خوش ہوا اور وہ چلا گیا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۰۱)

اسی طرح عبداللہ منازلؒ کہتے ہیں کہ: "جو شخص کسب و ہنر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ وہ اس شخص سے ہزار گنا بہتر ہے، جو کسب و ہنر نہیں کرتا اور خلوت نشین ہو کر اپنا بوجھ دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔" (ایضاً، ص ۲۰۹)

۴۔ سماع اور وجد

محفلِ سماع کے انعقاد اور حرمت کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہے کہ علمائے شریعت تو ایک طرف صوفیوں ہی بعض سلسلے اسے ناجائز بلکہ حرام قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں مشرکین مکہ کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے پاس غنا و موسیقی کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ ارشادِ باری ہے:

وَ مَا کَانَ صَلَاتُہُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَاءً وَّ تَصْدِیَۃً (۸/۳۵)

اور ان لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

موسیقی کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ساز اور آواز۔ خدا تعالیٰ نے مُکَاءً وَّ تَصْدِیَۃً کے الفاظ میں پوری موسیقی ساز اور آواز دونوں کی مذمت کر دی ہے۔ موسیقی کی سُریں اور نغمے مکاءً کی اور ساز و مزامیر تصدیۃً کی ذیل آتے ہیں۔ اور حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ موسیقی سے دِل میں نفاق یوں ابھرتا ہے۔ جیسے بارش سے گھاس اُگ آتی ہے۔ نیز حضور اکرم ﷺ نے گانا بجانے والیوں کی خرید و فروخت اور انہیں موسیقی کی تعلیم دلانے سے منع فرمادیا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

سرود و رقص کے دلائل

اب ان صوفیوں کی خودتراشیدہ احادیث بھی سُن لیجئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِمَنْ کَانَ قَلْبُہٗ حَیًّا عَنِ الدُّنْیَا مَیِّتًا

جس کا دل (خدا کی محبت میں) زندہ اور دنیا کی طرف سے مردہ ہو اس کے لئے سرود مباح ہے۔

۲۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِاَھْلِہٖ

سماع اس شخص کے لئے مباح ہے، جو اس کا اہل ہے

(مرشد کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۱۵۱، از صادق فرغانی)

واضح رہے کہ سماع کا لفظ دورِ نبویؐ میں صرف سننے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا جیسے سماع موتیٰ، سرود کی محفلوں کے لئے سماع کا لفظ بہت بعد کی پیداوار اور صرف صوفیوں کی قوالیوں کے لیے وضع کی گئی۔

پھر وجد اور رقص کے جواز میں یہی فرغانی صاحب فرماتے ہیں:

"وجد کئی قسم کے ہیں۔ عوام کو بھی وجد ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی ذات میں فنا ہو جاتے ہیں ان کو وجد سے بہت سے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ دیکھو جب مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بے ہوش ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے مگر ان کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ فنا فی اللہ تھیں۔ جب

کسی پر وجد اس قدر طاری ہو جائے کہ وہ بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگے، تو وہ معذور ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْکَ" تو آپ بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگے۔ پھر جب آپ نے حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کو فرمایا کہ اَنْتَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا اَنْتَ اَخِیْ (تو میرا بھائی ہے) تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ رقص کے اہل ہیں، ان کے لئے رقص مباح ہے۔" (ایضاً، ص ۱۵۳)

دلائل کا جائزہ

اب دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ تو ۱۱ھ میں فوت ہو گئے اور امام جعفر صادق ۱۳ رجب ۸۰ھ کو پیدا ہوئے لیکن فرغانی صاحب فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر کو فرمایا اَنْتَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ تو آپ نے ایسا ہی کیا (یعنی رقص کیا)۔ اب یہ تو رہی آپ کی تاریخ دانی۔ رہے دوسرے اکاذیب تو یہ ان حضرات کو ورثہ میں ملے ہیں۔ جیسا کہ امام مسلمؒ نے بر وقت مطلع فرما دیا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ فرغانی صاحب نے بھی ابن عربی کی طرح یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اس کتاب کے مندرجات رسول اللہ ﷺ پر بحالت کشف پیش کئے گئے اور ان کی توثیق کے بعد شاملِ کتاب کئے گئے ہیں۔

پھر فرغانی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر سرود سنتے وقت بے اختیار ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے سے اس کا عمامہ گر پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ جب حضور اکرم ﷺ معراج سے واپس آئے تھے، تو دوسرے روز اصحابِ صفہ کے پاس گئے وہ نہایت بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے جس سے آپ پر وجد طاری ہونا شروع ہوا اور بڑھتا بڑھتا یہاں تک پہنچا کہ آپ ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور آپ کا عمامہ مبارک سر سے گر گیا۔ جب آپ اصلی حالت میں آئے، تو اصحاب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جو یہ حالت آپ پر طاری ہوئی ہے۔ اس میں سے ہم کو بھی کچھ عنایت کیجئے۔ آپؐ نے اپنی دستار پھاڑ کر ان میں تقسیم کر دی۔" (ایضاً، ص ۱۵۴)

ایں گل دیگر شگفت

فرغانی صاحب کی افسانہ نگاری قابلِ داد ہے۔ البتہ اگر یہ خیال کر لیتے کہ معراج مکہ میں ہوا تھا اور اصحابِ صفہ مدینہ میں مسجدِ نبوی کے چبوترہ پر بیٹھنے والے صحابہؓ تھے، تو ان کی دروغ گوئی پر شاید

کچھ پردہ رہ جاتا۔

پھر فرماتے ہیں: "جو لوگ اولیاء اللہ کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ صوفی نے اس شعر کا مطلب کیا سمجھا جو اسے وجد ہو گیا، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ اونٹ پر بھی اعتراض کریں کہ رجز سے اسے وجد تو ہو جاتا ہے، حالانکہ نہ وہ زبان جانتا ہے نہ اُن کا مفہوم سمجھتا ہے۔"

آخر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سچی بات فرغانی صاحب کے منہ سے نکل ہی گئی۔ اچھی آواز سفلی جذبات کو اُبھارتی اور ہر ایک کو، حتیٰ کہ جانوروں کو بھی اچھی لگتی ہے۔ ریڈیو کی دھنوں پر بچے بھی جھُومنے لگتے ہیں۔" ہم پوچھتے ہیں پھر اس سے معرفتِ الٰہی کا کیا تعلق ہے؟ کیا اونٹ پر بھی اسرار منکشف ہوتے ہیں، جو صُوفی پر ہوتے ہیں؟ یا ان بچوں پر جو بغیر مطلب سمجھے ریڈیو کی آواز پر جھومنے لگتے ہیں۔

سیدھے اور صاف لفظوں میں اعتراف کر لینا چاہئے کہ صوفیوں میں ایک طبقہ عیاش طبقہ ہے جو عشق بازی، کانوں کی عیاشی اور ہوس رانی کے لئے تقدس کے پردوں میں یہ محفلیں رچاتا ہے۔ اب ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہی صوفیوں کے سلف صالحین کے اقوال پیش کرتے ہیں:

اللمع فی التصوف کے مصنف ابو النصر سراج طوسی اس کتاب کے صفحہ ۵۳۰ پر لکھتے ہیں:

"کچھ لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ تصوف سے مقصود صرف یہ ہے کہ قوالی کی مجلسوں میں شریک ہوا جائے اور بہ تکلف وجد طاری کیا جائے اور پُر تکلف کھانوں کے ساتھ رفقاء کو جمع کیا جائے اور درد انگیز عشق آفرین قصائد ترنم آمیز لہجہ میں پڑھے جائیں خصوصاً ایسے اشعار، جو صوفیاء کی عشق بازی اور ہوس رانی کی عکاسی کرتے ہوں۔ حالانکہ تصوف سے یہ مقصود نہیں نہ ہی یہ ہے کہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھُلے بندوں عشق بازی کا بازار گرم کیا جائے اور موسیقی کے نغمات پر حال کھیلا جائے۔ اور ہاؤ ہو کا غلغلہ بلند کیا جائے۔"

اس کے برعکس جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:

"صوفی پر تین حالتوں میں رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے (۱) جب وہ گانا سنتا ہے اور اس پر کیف و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ (۲) جب منہ میں لقمہ ڈالتا ہے اور (۳) جب زبان سے کچھ کہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ تو بلا ضرورت کچھ کھاتا ہے اور نہ بات کرتا ہے اور نہ سنتا ہے۔"

(الفکر الصوفی، ص ۱۰۸)

گویا جنیدی صاحب کے نزدیک وجد و سماع و رقص صرف جائز ہی نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی

کے نزول کا وقت ہوتا ہے۔

سماع کے لئے کسی شرعی دلیل کی ضرورت نہیں

حضرت علی ہجویریؒ کا ذکر ہو رہا ہے:

"آپ خود سماع سنتے تھے اور اسوۂ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سند اپنے عمل کی تائید میں لاتے تھے۔ فرماتے ہیں مشائخ صوفیاء اباحتِ سماع کے متلاشی نہیں رہے اس لئے کہ کسی عمل کو اس کی اباحت کی بناء پر نہیں فوائد کی بنا پر اختیار کرنا چاہتے۔ تلاشِ اباحت میں عوام رہے ہیں۔ سندِ جواز چار پایوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام از آقا بید ارنجت، ص ۱۵)

ملاحظہ فرمائیے، اباحت کے لئے سندِ جواز تلاش کرنے کی علی ہجویریؒ کے نزدیک کیا وقعت ہے ان کے خیال میں سماع کے لئے سندِ جواز تلاش کرنا عوام کالانعام کا کام ہے۔ ان جیسے" اولیاء اللہ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟

بعض صوفیہ وجد و حال کو ایک اضطراری کیفیت بتلاتے ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ یہ بھی ان لوگوں کی عیاری ہے۔ وہ صرف تقدس کے جامہ میں ہر طرح کی عیاشی سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں۔ جب رفاعی فرقہ کے فقیروں کا امیر افرم کے سامنے امام ابن تیمیہؒ سے مناظرہ ہوا تو ان فقیروں نے بھی یہی بات کہی تھی کہ:

"یہ اقوال و افعال ہم سے اضطراراً سرزد ہوتے ہیں۔ ہم پر حال اور وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ان کا روکنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ اسی طرح جس طرح چھینک کا روکنا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا اور یہ حال اور وجد بھی اللہ ہی طرف سے ہے، تو امام موصوف نے جواب دیا کہ چھینک تو خدا ہی کی طرف سے ہے مگر یہ اقوال و افعال خبیثہ شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا اور اس کا رسول ان کاموں سے منع کرتا ہے اور وہ جن باتوں سے ہم کو منع کردیں وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتی۔ امام موصوفؒ نے کہا کہ اس کی مثال یہ ہے کہ کفر اور فسق کا صدور بھی خدا کی مشیت ہی سے ہوتا ہے، لیکن کوئی شخص اسے جائز نہیں سمجھتا۔

وجد اور حال کا علاج

رفاعی شیخ نے پوچھا کہ پھر اس اضطراری وجد و حال کو کیونکر روکا جا سکتا ہے۔ امام موصوف نے فوراً جواب دیا "شرعی کوڑوں سے" اس پر امیر افرم ہنس پڑا۔ امام موصوف نے کہا۔ "ہاں! پھر اگر شرعی کوڑوں سے کام نہ چلے، تو تلوار محمدی ﷺ سے۔" یہ کہہ کر امیر افرم کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور اسے ہوا میں

بلند کر کے کہا یہ شخص (امیر افرم) رسول اللہ ﷺ کا نائب اور ادنیٰ غلام ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار ہے۔ اب جو شخص کتاب و سنت سے رُوگردانی کرے گا، اس کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔" (امام ابن تیمیہؒ، از کوکن عمری، ص ۱۶۵)

رفاعی شیخ نے یہ بھی کہا کہ ہمارے کچھ باطنی امور و احوال ہیں، جن کو اہلِ نظر نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ امام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ "ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، حقیقت و مجاز سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا عام اس سے کہ وہ مشائخ ہوں یا فقیر، بادشاہ ہوں یا اُمراء، علم ہوں یا قاضی۔ اس لئے کہ ساری مخلوق پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت واجب ہے۔ یہ اہلِ باطن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔" (ایضاً، ص ۱۶۴)

سماع کے متعلق صُوفیائے حق کا فتویٰ

ایک اور بزرگ شیخ احمد بن ابراھیم واسطی ہیں، جن کو شیخ عبدالحق دہلوی عالم عامل اور عارفِ کامل کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "یہ جو کہا جاتا ہے کہ شعر کو، نہ کہ قرآن کو طبیعت بشری سے خاص مناسبت ہے۔ اس لئے اشعار سُن کر دل میں قدرتاً تحریک پیدا ہوتی ہے۔ سو یہ قول لغو و بے حقیقت ہے۔ اس لئے کہ شعر کے وزن اور سُر تال پر حرکت کرنا جبلّتِ حیوانی کا تقاضا ہے۔ چنانچہ حیوانات اور بچے سب اچھی موسیقی سے اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ فطرتِ حیوانی ہے انسان کی اعلیٰ فطرت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے۔ جن کے دلوں میں محبتِ الٰہی حلاوت کر چکی ہے جیسا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد آنے والوں کا حال تھا۔ سو اُن کے قلوب کو حرکت میں لانے والی اور ان کے شوق و وجد، رقت اور خشوع کو بڑھانے والی شے قرآن پاک کی سماعت ہی ہو سکتی ہے۔" (تصوف اسلام ص ۱۵۶)

بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ سماع میں اصل وجد میں لانے والی چیز موسیقی کی بجائے شعر کی شعریت اور حقیقت ہوتی ہے، تو ہم عرض کریں گے کہ دورِ جاہلیت میں لبید ہی ایک ایسا شاعر تھا جس کے کلام کو حضور اکرم ﷺ پسند فرماتے تھے۔ مثلاً اس کا یہ شعر آپ کو بہت پسند آیا: (بخاری، کتاب المناقب باب ایام الجاہلیہ)

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ

سن لو کہ اللہ کے سوا جو چیز بھی ہے وہ باطل ہے اور ہر ایک نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے

انہیں لبید کو ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اپنا کوئی کلام سناؤ، تو کہنے لگے جب سے قرآن دل

میں رچ بس گیا ہے میں نے شعروشاعری کو دل سے نکال دیا ہے۔

سماع کے شرعاً حرام ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ بعض اکابر صوفیاء نے بھی اس کی حُرمت کا فتوےٰ دیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی اسے شرعاً ناجائز قرار دیتے ہیں۔ (تصوفِ اسلام، ص ۱۲۱)

۲۔ خود حضرت علی ہجویری سماع سنتے تھے، لیکن شرعاً اسے ناجائز سمجھتے تھے (ایضاً، ص ۵۸)

۳۔ عبداللہ غزنویؒ نے سماع کو ناجائز قرار دیکر قرآن سننا ہی اپنا شعار بنالیا تھا۔ (سوانح، مرتبہ عبدالجبار غزنوی ص ۴۵)

سماع کی دلدادگی

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بعض اکابر صوفیاء ایسے بھی ملتے ہیں جو سماع کے اتنے رسیا تھے کہ مرتے دم بھی قرآن سننے کی بجائے کسی قوال کو بلانے کی تاکید کرتے یا سماع سُن کر جان دیتے رہے ہیں۔ مثلاً:

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے متعلق منقول ہے کہ ان کے یہاں مجلسِ سماع گرم تھی۔ قوال، احمد جام کی غزل گا رہا تھا۔ جب یہ غزل گاتے گاتے نوبت اس شعر پر پہنچی:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو حضرت کا حال برگشتہ ہوگیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۷) اور بعض روایات میں ہے کہ تین دن اسی حالت میں رہ کر وفات پائی۔

ایک اور بزرگ فیض بخش صابری چشتی ہیں جب ان کی موت کا وقت قریب آیا۔ قوالوں کو بلایا، ایک قوال قادر بخش کو نعت پڑھنے کو کہا۔ اس نے یہ غزل شروع کی:

منم خاکِ درِ کوئے محمدؐ   اسیرِ حلقۂ موئے محمدؐ   قتیلِ نوکِ شمشیرِ نگاہش   شہیدِ تیغِ ابروئے محمدؐ

تو آپ پر وجد طاری ہوا اور اسی حالت وفات پائی۔

کہاں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ اپنے مرنے والوں کو کلمۂ شہادت کی تلقین کرو اور ان کے پاس سورۂ یٰسین پڑھو اور کہاں ان اولیاء اللہ کی قوالیوں سے یہ دلدادگی ۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

اب فرقۂ نوشاہیہ کے سماع و وجد کا حال بھی ذرا سُن لیجئے:

پوشیدہ نہ رہے کہ فرقہ عالیہ نوشاہیہ میں سب لوگ صاحبِ وجد و سماع و شوق و ذوق و مستی

ہیں مگر فقرائے سلسلہ پاک رحمن سماع کے وقت سب سے زیادہ مست ہو جاتے ہیں جب تک ان کے پاؤں میں رسہ ڈال کر الٹا نہ لٹکائیں اور ساعت دو ساعت اسی حالت میں رقص نہ کر لیں سرد نہیں ہوتے اور اگر اس عمل سے ہوش میں نہ آئیں، تو اسی حالت میں ان کو زمین پر کھینچتے ہیں جب تک وہ ہوش میں نہ آ جائیں۔ رسن ان کے پاؤں سے نہیں کھولا جاتا۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۶۹)

ان نوشاہی "اولیاء اللہ" پر سماع کی محفل کے بغیر بھی وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ایک واقعہ سُن لیجئے:

حافظ برخوردار قادری نوشاہی کا سماع

"تذکرہ نوشاہی میں ہے کہ ایک روز حافظ صاحب اپنے خُسر کے ہاں حالتِ جذب و استغراق میں بیٹھے تھے۔ گھر کے سامنے ایک زمیندار کی لڑکی چرخہ کات رہی اور ساتھ کچھ گا بھی رہی تھی۔ اس کے سرود نے حافظ صاحب پر حالتِ وجد طاری کر دی۔ لڑکی کے خاموش ہونے پر فرمایا۔ "اے لڑکی! ایک بار پھر اسی طرح نغمہ سرائی کر۔" لڑکی شرم کے مارے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کے پیٹ میں سخت درد اُٹھا اور حالتِ نزع تک جا پہنچی۔ علاج معالجہ سے فائدہ نہ ہوا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کے والدین آپ کے پاس آئے اور معذرت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ "اسے میرے رُوبرو لاؤ۔" جب لڑکی آپ کے سامنے حاضر ہوئی، تو فرمایا: "اے لڑکی! پھر اسی طرح نغمہ گا۔ انشاء اللہ اچھی ہو جائے گی۔" چنانچہ اس لڑکی نے وہی نغمہ اسی انداز میں گایا۔ آپ کی توجہ سے اسی وقت صحت یاب ہو گئی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۸۸)

دیکھ لیجئے دوسرے لوگوں کو اپنے شعبدہ کے دام میں پھنسا کر ان اولیاء اللہ کو اپنی حیوانی خواہشات کو پورا کرنے کا کیسا فن آتا ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہی رہی کہ جب لڑکی ابھی تک ٹھیک بھی نہ ہوتی تھی، تو اُس نے اسی انداز اور سُر میں گا کیسے لیا؛

ابوسعید اور ابوالحسن خرقانی کا سماع

" روایت ہے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی سماع نہیں سنا کرتے تھے۔ ایک روز ابوسعید آپ کی زیارت کے لئے خرقان آئے اور کھانے سے فارغ ہو کر سماع کی اجازت طلب کی۔ آپ (ابوالحسن خرقانی) نے فرمایا: "ہم سماع نہیں سنا کرتے، آپ کی وجہ سے سُن لیتے ہیں۔" قوالوں نے ایک شعر پڑھا،

تو ابوسعید نے کہا "اے شیخ ! اب وقت ہے آپ اٹھیں۔" ابوالحسن اٹھ کھڑے ہوئے اور تین بار اپنی آستین کو وجدانہ حرکت دی اور سات بار حالتِ وجد میں زمین پر اپنے پیر مارے۔ آپ کا وجد میں آنا تھا کہ خانقاہ کی دیواریں آپ کے ساتھ ہلنے لگیں۔ ابوسعید نے کہا: "حضرت ! بس کیجئے کیونکہ ساری عمارت گر جائے گی۔ اور قسم ہے اس ذات وحدہٗ لاشریک کی کہ آسمان و زمین بھی آپ کے ساتھ رقص کرنے لگیں گے۔" اس پر ابوالحسن خرقانی نے اپنے مریدوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: "سماع اس شخص کے لئے جائز ہے، جو اوپر عرش تک اور نیچے تحت الثریٰ تک دیکھتا ہو۔" آپ نے مزید فرمایا: "اگر تم سے کوئی دریافت کرے کہ رقص کیوں کرتے ہو، تو کہنا گزرے ہوئے لوگوں کی موافقت میں اور جن لوگوں کے لئے سماع جائز ہے، وہ ایسا کرتے ہیں۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۱۱)

غور فرمایئے ابوالحسن خرقانی جو سماع و وجد سنا ہی نہ کرتے تھے، ابوسعید کی درخواست پر پہلی ہی دفعہ سماع سنا اور وجد میں آتے، تو کیسا زلزلہ بپا کر دیا۔ پھر آپ نے سماع کے جواز کی شرائط اور دلائل بھی کتنے شاندار فراہم کر دیئے ہیں۔

واقعی ایسے لوگوں کا علاج وہی ہے، جو امام ابن تیمیہؒ نے تجویز کیا۔ اور ان لوگوں کا خواجہ عبدالحکیم انصاری مصنف حقیقت وحدتُ الوجود نے صحیح تعارف کرا دیا ہے، کہ "ایسے لوگ شرابی، کبابی ہوتے ہیں اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہندو جوگیوں سے یوگ وغیرہ سیکھ اور ریاضتیں کر کے لوگوں کو شعبدے دکھاتے پھرتے ہیں۔"

۵۔ جام و مے کی شاعری

بسطامی، شبلی اور ابویزید کے زمانہ سے عصرِ حاضر تک بعض صوفیاء اور مجذوبوں نے تکالیف شرعیہ کو غیر ضروری قرار دینے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جمالیاتی وسائل کی مدد سے وجدانی ہیجان پیدا کر کے سامعین میں جذب و مستی کی ایک مصنوعی کیفیت پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے لئے بالخصوص شاعری کا سہارا لیا گیا۔ یہ شاعری تصوف کی زبان (اسرار و رموز) میں شراب کی مدح سرائی کرتی ہے۔ حالانکہ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس میں محبت کے پیالے کو ساقی (شمس الدین) گردش میں لاتا اور پیش کرتا ہے۔ مثلاً حافظ شیرازی کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

الا یا ایها الساقی ادر کاسا و ناولها　　که عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکل ها

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید   کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ رسم منزل ہا

ترجمہ: اے ساقی! جام کو گھما اور پیش کر کہ عشق پہلے پہل تو آسان معلوم ہوتا ہے۔ پھر بہت سی مشکلات آپڑتی ہیں۔ اگر تجھے پیرِ مغاں (شراب خانہ کا شیخ) کہتا ہے کہ اپنا مصلیٰ شراب سے رنگین کر تو ایسا ضرور کر۔ کیونکہ سالک منازلِ سلوک کی راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔

دیکھئے ان اشعار میں تصوف اور شراب کو لازم و ملزوم کر کے پیش کیا گیا ہے۔

فارسی زبان میں اس قسم کی شاعری کو رواج دینے والے مندرجہ ذیل شعراء ہیں۔ (۱) جلال الدین رومی (مثنوی) (۲) شیخ فرید الدین عطار (مثنوی) (۳) ابو سعید (رباعیات) (۴) حافظ شیرازی (غزلیں) اور (۵) عبد الرحمن جامی (نظمیں)

عربی زبان میں ابن الفارض اور تستری کی نظمیں یہی موضوع پیش کرتی ہیں۔ عربی کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تَعَالَوْا نُخَرِّبُ الجَامِعَ   وَ نَجْعَلُ فِیهِ خَمَّارَہْ

آؤ ہم لوگ مسجد کو ویران کریں اور اس میں شراب خانہ بنائیں۔

وَ نَحْنُ نَکْسِرُ المِنْبَرَ   وَ نَجْعَلُ مِنْہُ طَنْبَارَہْ

اور منبر کو توڑ کر اس سے ساز و مزامیر بنائیں۔

وَنَحْنُ نُخَرِّقُ المُصْحَفَ   وَ نَجْعَلُ مِنْہُ ذَمَّارَہْ

اور قرآن کو پھاڑ کر اس کی بانسری بنائیں

وَ نَنْتِفُ لِحْیَۃَ القَاضِیْ   وَ نَجْعَلُ مِنْہُ اَوْتَارَہْ

اور قاضی کی داڑھی کو اکھاڑ کر اس سے تانت بنائیں

(تاریخ دعوت و عزیمت۔ ص ۱۹۳، ج ۲)

دیکھا آپ نے شراب اور رقص و سرود کی محفلیں سجانے کے لئے کس طرح کتاب اللہ اور شعائر اللہ کا تمسخر اڑایا گیا ہے۔

پھر اسی قسم کی صوفیانہ شاعری ہندوستان میں بھی پہنچی اور اردو کے شعراء نے بھی اس موضوع پر جی بھر کر طبع آزمائی کی۔ کسی شاعر نے تو یوں کہا:

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر یا وہ جگہ بتا دے جس جا خدا نہیں

اور کسی نے یوں کہا ۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

پھر کوئی صاحب ساقی کے بدیں الفاظ مشکور ہوتے ہیں :

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللہ

نہ مے نہ شعر، نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب سکوت کوہ لب جوئے و لالۂ خودرو !

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو !

پھر کسی نے یوں آرزو کی ۔

لا اک بار پھر وہی بادہ و جام اے ساقی ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی !

پنجابی زبان میں جن متصوف شعراء نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ان میں بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً بلھے شاہ فرماتے ہیں :-

۱۔ پھوک مصلیٰ بھن سٹ لوٹا۔ نہ پھڑ تسبیح ، عاصا ، سوٹا × عاشق کہندے دے دے ہوکا۔ ترک حلالوں کھا مردار

۲۔ بلھیا پی شراب تے کھا کباب ہیٹھ بال ہڈاں دی اگ × چوری کر تے بھن گھر رب دا، اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ

غرض تصوف کی اس شاعری کا جس میں شرابِ معرفت کا ذکر ہوا ور ساقی ، جام وسبو وغیرہ الفاظ کو تلمیحات اور تلویحات کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ ہر طرف چرچا ہو گیا اور وہ شراب جس کی تیاری اور فروخت تک کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے دس متعلقہ آدمیوں پر لعنت فرمائی تھی۔ تصوف کی دنیا میں شراب اور اس کے متعلقات تقدس کا جامہ اوڑھ کر جب سامنے آئے ، تو نفرت کے بجائے ان الفاظ اور اشیاء سے مؤانست پیدا ہونے لگی ۔

وجد و سماع کی محفلوں میں قوالیوں کا رواج ہوا تو قوالوں کی ایک فوج ظفر موج پیدا ہو تی۔ جنہوں نے عوام میں اس شاعری کو مقبول بنایا۔ ادھر وجد و سماع کی محفلوں میں ایسی قوالیاں لازم قرار پائیں ، اور یہ بزرگانِ دین اس ذریعہ سے سلوک کی منازل طے کرتے رہے اور نوبت بایں جارسید کہ بعض بزرگ تو مرتے وقت بھی کلمۂ شہادت یا قرآن کی تلقین کی بجائے کسی قوال کو بلانے کی تلقین کرنے لگے ۔ جیسا کہ وجد و سماع کے سلسلہ میں ایک دو اولیاء اللہ کے واقعات پہلے بیان ہو چکے ہیں ۔

شراب کی دلدادگی

پھر کچھ اولیاء ایسے بھی گزرے ہیں جنہیں سرخ شراب بہت پسند آئی تھی چنانچہ غلام محی الدین قادری جالندھری نے اس پر پورا قصیدہ ہی لکھ ڈالا جس میں سے چند اشعار حسب ذیل ہیں: (ماخوذ از ریاض السالکین، ص ۲۶۵)

ساقی پلا دے جام مے خوشگوار سرخ — تا میری چشم کو کرے اس کا خمار سرخ
ہر شش طرف جو نظر کروں آنکھ کھول کر — آوے جہاں نظر مجھے چوں لالہ زار سرخ
حیوان و جن ، کان ، نباتات سر بسر — دریا و دشت ، بیشہ و ہر کوہ و غار سرخ
محفل میں جا کے دیکھوں تو مطرب ہو سرخ پوش — طنبورہ سرخ ، چنگ کی ہر تار تار سرخ
یاور ہو بخت گر مرا تو کچھ عجب نہیں — اے قادری جو دیکھوں میں ایسی بہار سرخ

پھر کئی تذکروں میں اولیاء اللہ ایسے بھی ملتے ہیں جو فی الواقعہ اور علی الاعلان شراب پیا کرتے تھے۔ اور شیخ حسین لاہوری تو اس وقت تک کسی کو مرید بھی نہ بناتے تھے جب تک وہ ان کے ہاتھوں شراب کا جام نوش نہ فرمالے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ طریقت کو شریعت سے ماخوذ بنانے والے صوفیاء نے بھی ایسے لوگوں کو دنیائے ولایت سے خارج نہیں کیا۔ ان کے نام بدستور تذکروں میں عزت و تکریم سے لئے جاتے انہیں قدس سرہٗ لکھا جاتا ہے اور پوری عقیدت سے ان کا ذکرِ خیر کیا جاتا ہے۔

۶۔ تصورِ شیخ

تصورِ شیخ خدا سے دور رکھنے کا ذریعہ ہے

صوفیاء نے سلوک کی منازل طے کرانے کے لئے تین درجے مقرر کر رکھے ہیں۔ (۱) فنافی الشیخ (۲) فنافی الرسول (۳) فنافی اللہ۔ فنافی الشیخ کے درجہ کی ابتدا "تصورِ شیخ" سے کرائی جاتی ہے۔ تصورِ شیخ سے مراد صرف پیر کی "غیر مشروط اطاعت" ہی نہیں ہوتی، بلکہ اسے یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس کا پیر ہر وقت اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور بوقتِ ضرورت اُس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اس عقیدہ کو مرید کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے اسے یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ہر وقت پیر کی شکل کو اپنے ذہن میں رکھے۔ یہی واہمہ اور مشق بسا اوقات ایک حقیقت بن کر سامنے آنے لگتا ہے۔

مسلمانوں کو صرف حضور اکرم ﷺ کی "غیر مشروط اطاعت" کا پابند کیا گیا ہے، کیونکہ وہ جو

کچھ کہتا ہے اللہ کے حکم سے کہتا ہے، لیکن صوفیاء کی یہ تعلیم مرید اور پیر کو 'عبد اور معبود' کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ جس کا حضور اکرم ﷺ یا کسی دوسرے نبی کو بھی حق نہ تھا۔ صوفیاء نے پیری کے فن کو ایک خاص تکنیک دے کر عوام پر اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک خدا کے ہاں رسائی نہیں پا سکتا جب تک باقاعدہ کسی سلسلہ طریقت میں داخل نہ ہو۔ پہلے تصورِ شیخ کی مشق کرے، حتیٰ کہ فنافی الشیخ ہو جائے، یعنی اسے اپنی ذات کے لئے حاظر ناظر، افعال و کردار اور گفتار کو دیکھنے اور سننے والا سمجھنے لگے۔ تب جا کر یہ منزل ختم ہوتی ہے اور عملاً ہوتا یہ ہے کہ مرید بیچارے تمام عمر فنافی الشیخ کی منزل میں ہی غوطے کھاتے کھاتے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا اللہ اور اس کے رسول سے بیگانہ کر کے اپنا غلام بنانے کا کارگر اور کامیاب حربہ ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی کی بات نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا درج ذیل اقتباس اس حقیقت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے:

"ان (صوفیاء) کے طرق میں بعض ایسی چیزیں، جو منصوص میں وارد نہیں، شرطِ طریق ہیں اور شرط بھی اعظم و اہم، چنانچہ تصورِ شیخ باوجودیکہ صریحاً کسی نص میں وارد نہیں اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہو گیا ہے اور اسی خطرہ و غلو کے سبب مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ اس کو منع فرماتے ہیں مگر باوجود اس کے اکابر نقشبندیہ اس کو مقصود فرماتے ہیں۔ چنانچہ انوار العارفین ذکر تصورِ شیخ میں کنز الہدایہ بحوالہ مکتوبات مجدد صاحب کا ارشاد نقل ہے کہ:

"ذکر تنہا بے رابطہ و بے فنافی الشیخ موصل نیست ذکر ہر چند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط برابطہ محبت و فنافی الشیخ است۔" (تجدید تصوف و سلوک، ص ۴۴۲)

(ترجمہ) "فنافی الشیخ ہونے کے بغیر تنہا ذکر سے خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی، اگرچہ ذکر بھی رسائی کا ایک سبب ہے، لیکن اس کی غالب شرط (پیر سے) محبت کا تعلق اور اس میں فنا ہونا ہے۔"

اقتباس بالا سے صاف واضح ہے کہ (۱) تصورِ شیخ کے عقیدہ کا قرآن و سنت میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ (۲) یہ عقیدہ انتہائی خطرناک اور گمراہ کن ہے۔ (۳) صوفیاء اور خصوصاً نقشبندیوں سے اسے اللہ کی رسائی کا سب سے بڑی اور اہم شرط قرار دیا گیا ہے۔

تصورِ شیخ اور بزرگوں کے اقوال

اب دیکھئے مولانا روم فلسفہ تصورِ ثلاثہ کی اہمیت کے لئے بیان فرما رہے ہیں:

پیرِ کامل صورت ظلِ الٰہ یعنی دیدِ پیر دیدِ کبریا !
ہر کہ پیر و ذاتِ اورا یک نہ دید نے مرید و نے مرید و نے مرید

یعنی پیرِ کامل فنافی الوجود سے فنافی الشیخ کا مقام عطا کرتا ہے اور فنافی الشیخ سے نکال کر فنافی الرسول کا مرتبہ عطا کرتا ہے۔ بعد ازاں فنافی اللہ کے مقام میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ سب مقام پیر و مُرشد کے طفیل ہی حاصل ہوتے ہیں، جو مُرید ایسا نہیں سمجھتا وہ قطعاً مرید نہیں ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۲۲۵)

اور معین الدین اجمیریؒ نے فرمایا کہ: "اگر روزِ قیامت خدا تعالیٰ کا جمال میرے پیر کی صورت میں ہو گا، تو دیکھوں گا، ورنہ اس کی طرف منہ بھی نہ کروں گا۔" (ریاض السالکین، ص ۲۳۱)

اور بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا کہ: "اگر قیامت کے دن خدا تعالیٰ میرے پیر کی صورت کے سوا کسی دوسری صورت میں اپنا جمال باکمال دکھائے گا، تو میں اس طرف آنکھ بھی نہ کھولوں گا۔" (اقتباس الانوار، ص ۲۹۰، مطبوعہ مجتبائی دہلی بحوالہ ایضاً)

اور شیخ محمد صادق نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی اگر پیرِ دستگیر کی صُورت میں ہوا، تو دیکھوں گا۔ ورنہ اسے بالکل نہ چاہوں گا۔" (ریاض السالکین، ص ۲۳۱)

دیکھا آپ نے تصورِ شیخ کا یہ فارمولا کیسے شاندار نتائج پیدا کر کے مرید کو بس شیخ ہی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

اندھی عقیدت

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ عقیدہ کس طرح ایک طرف تو پیر کو خدائی تقدّس عطا کرتا ہے اور دوسری طرف مرید کو اندھی عقیدت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حکیم فیض عالم صدیقی مصنف کتاب "اختلافِ اُمت کا المیہ" کے صفحہ ۹۴ پر لکھتے ہیں:

"میں آپ کے سامنے اپنا ایک واقعہ حلفیہ پیش کرتا ہوں۔ چند روز ہوتے میرے پاس ایک عزیز رشتہ دار آئے۔ جو شدّت کُشتہ پیری ہیں، میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ "فلاں پیر صاحب کے متعلق اگر چار عاقل بالغ گواہ پیش کر دُوں، جنہوں نے انہیں زنا کا ارتکاب کرتے دیکھا ہو، تو پھر اُن کے متعلق کیا کہو گے؟" کہنے لگے: "یہ بھی کوئی فقیری کا راز ہو گا، جو ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو گا۔" پھر ایک پیر صاحب کی شراب خوری اور بھنگ نوشی کا ذکر کیا، تو کہنے لگے: "بھائی جان! یہ باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں وہ بہت بڑے ولی ہیں۔"

راہِ سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے

جنید بغدادی کے مُرید کا دریا میں غوطے لگانے کی وجہ

تصورِ شیخ کے عقیدہ کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس کے راوی امام اہلسنت احمد رضا خاں مجدّدِ مائۃ حاضرہ ہیں اور غالباً "حدیقۂ ندیہ" کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی یا اللہ یا اللہ کہہ کر دریا عبور کر گئے، لیکن مرید کو یہ کہا کہ یا جنید یا جنید کہہ کر چلا آ۔ پھر شیطان لعین نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ کیوں نہ میں بھی یا اللہ کہوں، جیسا کہ پیر صاحب کہتے ہیں۔ یا اللہ کہنے کی دیر تھی کہ ڈوبنے لگا۔ پھر جنید کو پکارا، جنید نے فرمایا: "وہی کہہ یا جنید یا جنید۔" جب پار لگا، تو پوچھا، "حضرت! یہ کیا بات ہے؟" فرمایا: "اے نادان! ابھی تو جنید تک تو پہنچا نہیں اور اللہ تک رسائی کی ہوس ہے۔" (ملفوظات احمد رضا خاں بریلوی، ص ۱۱۷)

یہ ہیں اس تصورِ شیخ جیسی بدعت اور لعنت کے کرشمے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا کہ "جب بھی مجھے کوئی پکارے میں اس کے قریب ہوں، پکارنے والے کی دُعا اور جواب دیتا ہوں۔" پھر یہ بھی کہا ہے کہ: "میں تمہاری رگِ جان سے بھی قریب ہوں۔" اور یہ لوگ ایسے افسانے تراش کر لوگوں کو شرک میں مبتلا کرتے اور اللہ سے دُور رکھتے ہیں اور اپنی پرستش کرواتے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ کہ اگر اس بیچارے کے ضمیر سے حق کی آواز اٹھی بھی، تو اسے شیطانِ لعین کی آواز قرار دے کر آگے ایسا افسانہ جوڑا کہ وہ واقعی شیطانِ لعین کی ہی آواز معلوم ہونے لگے۔

۷۔ حضرتِ خضر علیہ السلام کی شخصیت

حضرت خضر علیہ السلام کون ہیں؟

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہم پہلے تفصیلی بحث کر آئے ہیں کہ ان کی شخصیت آج تک مختلف فیہ رہی ہے، کہ وہ نبی تھے یا ولی، کوئی جن یا کوئی فرشتہ تھے۔ جو تدابیر مشیّتِ الٰہی پر مامور تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُن کی لغزش کی وجہ سے عتاب فرماتے ہوئے بغرضِ تادیب حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا، لیکن ہمارے صوفیائے نے ان کو ولی قرار دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ کوششیں اُس وقت شروع ہوئیں جب اُن میں

یہ عقیدہ رائج ہوا کہ " ولایت نبوت سے افضل ہے۔" پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ یہ لوگ حضرت خضر علیہ السلام کو ایک زندہ وجاوید ہستی تسلیم کر کے اس سے ہر وقت رہبری کے خواہاں رہتے ہیں جب تک حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات اور رہبری حاصل نہ ہو، ولایت مکمل نہیں ہوتی۔ پھر حضرت خضر کی فرضی شخصیت کے متعلق کئی طرح کے افسانے تراشے گئے، جو اتنے عام ہوئے کہ شعر وادب میں بھی داخل ہو گئے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

تہیدستانِ قسمت را چہ سُود از رہبرِ کامل　　که خضر از آبِ حیوان تشنہ می آرد سکندر را

ترجمہ: بے نصیب لوگوں کو کامل پیر سے کیا فائدہ؟ خضر بھی تو سکندر بادشاہ کو زندگانی کے چشمہ سے پیاسا ہی واپس لے آیا تھا۔

اس فرضی قصہ کے متعلق مشہور متصوف اور مصنف "انسان کامل" عبدالکریم جیلی کی تحقیق یہ ہے کہ آب حیوان فی الواقعہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کے متعلق افلاطون نے یہ بات دریافت کی تھی کہ جو اس چشمہ کا پانی پی لے وہ مرتا نہیں۔ افلاطون خود اس مقام پر پہنچا اور اس نے اس سے پانی پی لیا، لہٰذا وہ ایک پہاڑ میں جس کا نام درا وند ہے، اب تک زندہ ہے۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو تھا، جو سکندر کا استاد تھا، جو لشکر سکندر نے ترتیب دیا اس میں حضرت خضر علیہ السلام بھی موجود تھے۔ مگر حضرت خضر علیہ السلام باوجود سکندر کی آرزو کے اسے جُل دے گئے اور اس چشمہ کا حال پوشیدہ رکھا۔ حالانکہ اس چشمہ کا حال حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھا۔ وغیر ذلک من الخرافات۔ (انسان کامل، ص ۴۰۰)

غالب اسی خیال کی تائید میں کہتا ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی؟

یہ حضرت خضر علیہ السلام کے فیض سے متعلق شعر تھا اور اب دوسرا شعر ان کی رہبری و راہنمائی اور ہدایت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی　　رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور جن صاحب نصیب لوگوں کو حضرت خضر علیہ السلام کی رہنمائی یا ملاقات حاصل ہو جائے، تو اس کی اولیائی میں کیا شک ہو سکتا ہے اب جن خوش قسمت بزرگوں کو یہ سعادت ملی، ان کے حالات

حضرت خضر سے ملاقات

(۱) حضرت محمد علی زندی کا ذکر چل رہا ہے۔ "ایک دن آپ قبرستان میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ میرے ساتھی تھوڑی مدت کے بعد علم حاصل کر کے آئیں گے اور عزت پائیں گے، میں یونہی گنوار رہوں گا۔ ناگاہ ایک طرف سے ایک پیر مرد نورانی شکل ظاہر ہوئے اور کہنے لگے: "میاں تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو؟" آپ نے کہا: "ہاں! یہی آرزو رکھتا ہوں۔" انہوں نے کہا: "تو میں ہر روز یہیں آکر علم پڑھایا کروں گا۔" یہ سن کر آپ خوش ہوئے اور تین برس تک ان سے علم[1] پڑھتے رہے۔ جب فارغ ہوئے، تو انہوں نے پوچھا: "اے عزیز! کیا تم نے سمجھا کہ یہ دولت علم تمہیں کس وجہ سے حاصل ہوئی؟" آپ نے نفی میں جواب دیا، تو بولے: "میں اللہ کا بندہ خضر ہوں۔ تم نے اپنی والدہ کو آزردہ نہ کیا تھا، یہ صرف اس کا صلہ ہے کہ میں تمہاری تعلیم پر مقرر ہوا۔" (مقربان حق، ص ۱۶۸)

اب دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ نے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس خود جانے کو کہا تھا لیکن ان بزرگ کے پاس حضرت خضر علیہ السلام خود پہنچ کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ پھر جو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو تین واقعات دیکھ کر ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ علم میرے بس کا روگ نہیں، لیکن یہ بزرگ متواتر تین سال ان سے علم حاصل کرتے رہے اور انہیں حضرت خضر علیہ السلام کا اس قسم کا علم ہضم ہوتا رہا۔

۲۔ ابوبکر وراق کا ذکر چل رہا ہے۔ "نقل ہے کہ آپ کو مدت سے آرزو تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت ہو۔ ہر روز قبرستان جاتے اور راستے میں ایک جزو قرآن کریم کا پڑھتے۔ ایک دن گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک نورانی شکل بزرگ سے ملاقات ہو گئی، جو کہنے لگے کہ اگر آپ پسند کریں، تو میں بھی تھوڑا سا وقت آپکے ساتھ گزار لوں۔" آپ نے اجازت دے دی۔ دونوں قبرستان گئے۔ راہ میں آپ اس بزرگ سے عمدہ عمدہ باتیں کرتے رہے۔ جب وہ جانے لگے، تو انہوں نے کہا: "آپ نے مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟ اے وراق! میں خضر ہوں، تو مدت سے چاہتا تھا کہ مجھ سے ملے۔ آج میں تیرا مصاحب ہوا، لیکن قرآن کریم کا جو جزو تو راستے میں پڑھا کرتا تھا میری باتوں کے سبب اس کی سعادت سے محروم رہا۔ اب سمجھ لے کہ جب صحبت خضر سے یہ نقصان ہوا، تو دوسرے لوگوں کی صحبت سے کتنا نقصان ہو

---

[1] حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم کیسی تھی۔ یہ "اولیاء اللہ کی اقسام" کے تحت ملاحظہ فرمایئے؛

گا پس تنہائی سب سے اچھی چیز ہے۔" (مقربانِ حق، ص ۲۰۷)

معلوم ہوتا ہے کہ (۱) حضرت خضر علیہ السلام اکثر قبرستان میں ہی ملتے ہیں ، نورانی شکل میں (۲) وہ اپنا تعارف خود کرواتے ہیں تاکہ شبہ نہ رہے ۔ (۳) ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص میری ملاقات کا مشتاق ہے۔

صوفیاء اور حضرت خضر علیہ السلام کی تاریخ

سلسلہ چشت میں غالباً خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں علومِ ظاہریہ کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کی رہنمائی سے سلطان ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) تک رسائی کی۔ (تاریخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۱۴۵)

پھر ان کے بعد دوسرے بزرگ علو ممشاد دینوری (م ۲۹۷ھ) ہیں ، جو "بیعت سے قبل حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت میں تھے اور ان ہی کے اشارہ سے بیعت ہوئی تھی۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۹)

پیرانِ پیر سے پہلی ملاقات

"غوث الاعظم قدس سرہٗ سے منقول ہے کہ ابتدائے حال میں میں نے خدا تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ "میں اس وقت تک نہ کھاؤں گا جب تک وہ خود نہ کھلائیں پلائیں گے اور میرے منہ میں لقمہ نہ رکھیں گے۔" چالیس دن بعد میرے پاس ایک شیخ آیا اور میرے پاس کھانا رکھ کر چلا گیا۔ بھوک کی شدت کے باوجود میں نے اپنے عہد کو یاد رکھتے ہوئے اس کھانے کی طرف توجہ نہ دی۔ اچانک میں نے آواز سنی، کوئی زور زور سے الجُوع الجُوع (بھوک، بھوک) پکار رہا ہے۔ اتنے میں شیخ ابوسعید اُدھر سے گزرے اور پوچھا: "عبدالقادر! یہ آواز کیسی ہے؟" میں نے کہا: "یہ میرے نفس کا اضطراب ہے مگر رُوح اپنی جگہ پر قائم اور مشاہدہ انوارِ خداوندی میں محو ہے۔" فرمایا میرے گھر چلو، عرض کی اس جگہ سے باہر قدم نہ رکھوں گا۔ وہ چلے گئے، تو ابُو العباس خضر تشریف لائے۔ فرمایا: "اٹھو ابوسعید کی خدمت میں جاؤ۔" میں اُن کی طرف چل پڑا، انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا: "اے عبدالقادر! جو کچھ میں نے کہا تھا وہ کافی نہ تھا۔ تو نے خضر کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔" پھر آپ مجھے مکان کے اندر لے گئے، کھانا تیار تھا، وہ لُقمہ لُقمہ میرے منہ میں ڈالتے جاتے تھے، یہاں تک کہ میں اچھی طرح سیر ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے خرقہ پہنایا اور میں ان کی صحبت

میں رہنے لگا" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کی کنیت ابو العباس ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی لڑکا عباس ہو، جس کے نام پر آپ نے یہ کنیت پسند فرمائی ہو۔

۲۔ اولیاء اللہ کے ہاں خضر کی بات کی اس قدر وقعت ہے کہ وہ اپنے خدا سے کئے ہوئے عہد کا بھی پاس نہیں کرتے اور اُن کا حکم مانتے ہیں۔

۳۔ دو ہی باتیں ممکن ہیں، یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ ابوسعید کا ہاتھ جس سے وہ لقمہ ڈالتے تھے، دراصل اللہ ہی کا ہاتھ تھا یا یہ کہ پیران پیر نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی۔

حضرت خضر علیہ السلام کی اضافی ڈیوٹی

قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۹۰ پر فرماتے ہیں کہ:

"ایک دن حضرت غوث اعظم منبر پر علوم و معارف بیان فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں اُٹھ کر چند قدم ہوا میں چلے اور زبان مبارک سے فرمایا یَا اِسْرَائِیْلِیُّ قِفْ فَاسْمَعْ کَلَامَ الْمُحَمَّدِیِّ یعنی اے اسرائیلی ٹھہر جاؤ اور محمدی کا کلام سنو۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا واقعہ تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا "کہ حضرت خضر علیہ السلام یہاں سے گزر رہے تھے، تو میں اُن کو اپنا کلام سنانے کے لئے ٹھہرانے گیا تھا، تو آپ ٹھہر گئے۔" (مکتوبات الف ثانی نمبر ۵۵، ج ۲۔ بہجۃ الاسرار، ص ۴۷۔ اخبار الاخیار فارسی، ص ۱۹)

اب دیکھئے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام بھی کیسی پُراسرار شخصیت ہیں۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین پر انسانی صورت میں ملے تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح سکندر رُومی کے لشکر میں بصورت انسانی شامل ہوئے، جو کہ کافر تھا۔ اور اسے آب حیات کے چشمہ سے پانی پینے سے بے نیل و مرام ہی واپس لے آئے۔ محمد علی صاحب ترمذی اور ابوبکر وراق کو قبرستان میں بصورتِ انسانی ملتے ہیں کسی کو وقوفِ عددی کی تعلیم دیتے ہیں اور کسی کو مکتب چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ پھر چھٹی صدی ہجری میں عبدالقادر جیلانی کو بصورتِ رجال الغیب ہوا میں اڑتے ہوئے ملتے ہیں اور وہ بھی زمین سے صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ عبدالقادر جیلانی چند قدم ہوا میں چل کر اور انہیں ٹھہرا کر اپنا کلام سنا کے چھوڑتے ہیں

پھر تو حضرت خضر علیہ السلام آپ کے ایسے مُرید ہوئے کہ انہیں کے ہو رہے۔

اب اُن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ایک تو خود اکثر اوقات آپ کی مجلس شریف میں شامل ہوتے اور مشائخ زمانہ میں سے جس سے بھی حضرت خضر کی ملاقات ہوتی، تو اس کو آپ کی مجلس میں حاضر ہونے کی تاکید فرماتے۔ (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۷۴) اور دوسری یہ کہ جب کوئی ولی یا ابدال فوت ہو جاتا، تو آپ اس کی خبر عبدالقادر جیلانی کو دیتے۔ پھر خواہ کسی چور یا کافر کو عبدالقادر جیلانی ابدال بنانے کا ارادہ کرتے، حضرت خضر علیہ السلام اس متعلقہ شخص کو اس کے علاقہ سے اٹھا کر آپ کے پیش کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب میں مناسب مقام پر دو واقعات تذکرہ نگاروں کے حوالوں سے پیش کر چکے ہیں۔

قطبُ الدّین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ) کو معلّم کے پاس لے جانا

۱½ سال کی عمر میں آپ کے والد فوت ہو گئے۔ جب پانچ سال کے ہوئے، تو والدہ نے اپنے کسی ہمسایہ کو کہا کہ آپ کو کسی معلّم کے پاس چھوڑ آئیں۔ راستہ میں ایک بزرگ ملے، اُنہوں نے دریافت کیا کہ اس لڑکے کو کہاں لے جاتے ہو؟ اور یہ جواب سن کر کہ تعلیم کے لئے مکتب لے جا رہا ہوں، فرمایا کہ میرے حوالہ کر دو، میں ایک معلّم کے پاس بٹھا دوں گا۔ ہمسایہ نے ان کے حوالہ کر دیا۔ وہ بزرگ خواجہ ابوحفص اوشی کے پاس لے گئے اور فرمایا: "احکم الحاکمین کا حکم ہے اس لڑکے کو توجہ سے پڑھاؤ۔" اور یہ فرما کر چلے گئے۔ استاد نے دستِ شفقت پھیر کر شاگرد سے فرمایا: "بڑے صاحبِ نصیب ہو کہ حضرت خضر تمہیں میرے حوالہ فرما گئے ہیں" (تاریخ مشائخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۱۷۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطبُ الدین کی تعلیم کے لئے اللہ تعالٰے نے جو ابوحفص اوشی کو منتخب کیا اور حضرت خضر کو استاد تک پہنچانے کا حکم دیا تھا اور نیز یہ بھی کہ ابوحفص اوشی پہلے سے ہی حضرت خضر کو جانتے تھے۔ اب یہ اللہ احکم الحاکمین کا حکم کس طرح پورا ہوا؟ یہ بھی شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی زبانی سنیئے:

"آپ (قطب الدین) حضرت شیخ (ابوحفص اوشی) کی خدمت میں علمِ ظاہری کی تحصیل کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت نے تختی لے کر کچھ تحریر فرمانے کا ارادہ کیا ہی تھا، کہ ندائے غیبی سے معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کی تحصیل ظاہری قاضی حمید الدین ناگوری کے حوالہ ہے۔"

گویا اس ندائے غیبی نے اللہ احکم الحاکمین کے ارشاد اور حضرت خضر رضی اللہ عنہ کی تکلیف فرمائی سب پر پانی پھیر کر قطب الدین کا اُستاد ہی بدل دیا۔ یہ ہے ہاتفِ غیبی اور حضرت خضر رضی اللہ عنہ کی حقیقت جن سے اِن اولیاء اللہ کو اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ایک روایت

امام اہل سنت احمد رضا خاں فرماتے ہیں:۔

"حضرت خضر" علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص اشھد ان محمدا رسول اللہ سن کر اپنے انگوٹھوں کو چومے گا۔ اور پھر اپنی آنکھوں پر لگائے گا۔ اس کی آنکھیں کبھی نہ دکھیں گی۔

(فتاوٰی رضویہ ص۳۸۲ بحوالہ بریلویت ص۲۲۹)

امام اہل سنت نے اس روایت کو امام سخاوی سے نقل کیا ہے جبکہ امام سخاوی خود یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "اس روایت کو کسی صوفی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس کے راوی محدثین کے نزدیک مجہول اور غیر معروف ہیں۔ نیز حضرت خضرؑ سے کس نے سنا اس کا کوئی ذکر نہیں۔"

گویا جس روایت کو امام سخاوی درج کر کے اسے مردود قرار دے رہے ہیں۔ امام اہل سنت اس بدعت کو رواج دینے کے لیے اسی مردود روایت سے استدلال فرما رہے ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کی نماز

ہمارے اکثر صوفیاء اور اولیاء قبرستانوں اور جنگلوں میں انہیں تلاش کرتے اور ان سے فیضیاب ہونے کو بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور ان سے ملاقات کے لئے بے قرار رہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے اوراد و ظائف کے علاوہ ایک مخصوص قسم کی نماز بھی وضع کی گئی ہے۔ اب اس نمازِ خضر کا طریقہ صادق فرغانی صاحب سے سنیے۔ تلقین مرشدِ کامل کے صفحہ ۲۴۰ پر رقمطراز ہیں:

"اس کے بعد اگر ہو سکے تو حضرت خضر رضی اللہ عنہ کی نماز کی بارہ رکعتیں پانچ سلاموں کے ساتھ پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد ایک مرتبہ سورۂ فیل، دوسری میں لایلاف، تیسری میں ماعون، چوتھی میں کوثر، پانچویں میں کافرون، چھٹی میں نصر، ساتویں میں تبت، آٹھویں میں اخلاص، نویں میں فلق، دسویں میں سورۃ ناس پڑھے۔ (گیارھویں بارھویں کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا) جو شخص اس نماز کو ہمیشہ پڑھے، اس کو حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات حاصل ہو جاتی ہے۔"

غور فرمایا آپ نے، نماز جیسی عبادت بھی غیر اللہ کے لئے پڑھنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اس سے

زیادہ صریح شرک بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ پہلے اپنے ایمان کی خیر منایئے، پھر حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات فرمایئے۔ اور ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، کہ اس طرح جو صورت آپ سے ملاقات فرمائے گی وہ شیطان ہی ہوگا، جو اپنے آپ کو خضر ظاہر کرے گا۔ کچھ بھی ہو، ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ اور اس پُراسرار ہستی کے حالات سے آپ مطلع ہو جائیں گے اور اس سے "فیض" بھی حاصل کر سکیں گے۔ لیکن یاد رکھئے! حضرت خضر علیہ السلام ہرگز زندہ نہیں ہیں۔ وہ فوت ہو چکے ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ دورِ نبوی علیہ السلام میں زندہ ہوتے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور ملتے، جہاد میں شرکت فرماتے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم سے ملاقات کرتے مگر کسی کمزور سی روایت سے بھی اس قسم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

حضرت خضر علیہ السلام کی ابدی زندگی کا عقیدہ

دائرۃ المعارف الاسلامیہ
مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی

زیرِ عنوان طریقت، ج ۱۲، ص ۴۶۰ پر درج ہے کہ:

"راسخ العقیدہ فقہاء نے اہلِ تصوف کے استاد الہامی (روحانی) کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔ جس کی بنا پر سلسلہ تصوف کو ایک ایسی مقدس ہستی کے مظاہر سے فیضان حاصل ہوتا ہے، جو پُراسرار اور غیر فانی ہے یعنی الخضر، جن کی ہادی طریقہ کی حیثیت سے سب سلسلے توقیر و تعظیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رہنما اور صوفی کی روح کو حقیقتِ علیا سے آشنا کرانے کے اہل ہیں۔ یہ عقیدہ غالباً تصوف کی کسی مستند کتاب میں نہیں پایا جاتا۔" (دائرۃ المعارف، بحوالہ بالا)

پھر اسی دائرۃ المعارف میں خواجہ خضر کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

"ہندوستان میں انہیں کنوؤں اور چشموں کی روح کا روپ سمجھا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے آس پاس انہیں دریا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے حضرت خضر علیہ السلام کا نام میکائیل کے نام کی جگہ بطورِ ایک بڑے فرشتہ کے لیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی خانقاہ سندھ کے ایک جزیرے میں بھکر کے پاس ہے جہاں ہر مذہب کے عقیدت مند زیارت کو جاتے ہیں۔" (دائرۃ المعارف، ج ۹، ص ۲۲)

۸۔ رجالُ الغیب سے استفادہ

رجالُ الغیب کی تسخیر

ہم پہلے باب میں بیان کر آئے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ اور چلہ کشیوں کے ذریعہ انسان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم

ارواح میں بے شمار قسم کی رُوحیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرشتے، جن، فوت شدہ انسانوں کی نیک اور بد رُوحیں شیطانی اور خبیث رُوحیں سب اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان نے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق کئی قسم کے جنتر منتر اور اوراد وظائف ان روحوں کو قابو کرنے کے لئے ایجاد کر لئے اور ان کو مسخر کر کے کئی قسم کی شعبدہ بازیاں دکھانا شروع کیں۔ ایسی رُوحوں کو عام طور پر رجال الغیب کے نام سے پکارا جاتا ہے اور دورِ نبوی ﷺ میں اِن رُوحوں سے کام لینے والے تین گروہ تھے۔ (۱) رہبان (۲) کاہن اور (۳) جادوگر۔ اور شریعت نے ایسے سب علوم و فنون کو کفر قرار دیا ہے۔

پھر آپ نے کئی ایسے فقیروں اور درویشوں کو بھی دیکھا ہوگا جو کسی ویرانے یا لبِ دریا ڈیرہ ڈال کر عموماً رات کو چلّہ کشی کرتے۔ اپنے گرد حصار کھینچتے اور کوئی جنتر منتر یا قرآن کی آیت یا دوسرے اوراد وظائف پڑھتے ہیں اور مقررہ چلّہ پورا کرتے ہیں۔ رات کو اس وظیفہ کی مقررہ تعداد کے پڑھنے کے دوران کئی قسم کی بد رُوحیں یا جن وغیرہ انہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ اگر چلّہ کاٹنے والا ان سے نہ ڈرے اور چلّہ پورا کرے، تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور ان خبیث رُوحوں کا حاکم بن جاتا ہے۔ ورنہ دورانِ چلّہ یہ رُوحیں اسے سخت اذیتیں پہنچاتی ہیں اور بعض دفعہ اسے ہلاک بھی کر دیتی ہیں۔ اب جو شخص اس چلّہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو پڑے ہوئے جن نکال بھی سکتا ہے۔ کسی چنگے بھلے انسان پر جن ڈال بھی سکتا ہے۔ لوگوں کو تعویذوں اور جنتروں کے ذریعے تکلیفیں بھی پہنچا سکتا ہے اور اُن رُوحوں کی وساطت سے غیب کی خبریں بھی دیتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اس کاروبار کے پیچھے پڑ گئے تھے، جسے اللہ نے کفر قرار دیا۔ اور یہی حال دورِ نبوی ﷺ کے رہبانوں، کاہنوں اور ساحروں کا تھا۔

آپ حیران ہوں گے کہ اس طبقہ صوفیاء میں سے اکثر حضرات کا کاروبار بھی اسی قسم کا ہوتا ہے۔ ان کے کشفِ قبور کے سلسلے، ریاضات، مجاہدات، چلّہ کشیاں وغیرہ بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں اور ان کے ثمرات (عوام کی زبان میں کرامات) بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ اب یہ مسئلہ چونکہ بہت نازک ہے۔ اس لئے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف ان اولیاء اللہ کے تذکرہ نگاروں کی عبارت پیش کر دیں گے۔ نتیجہ آپ خود نکال لیجئے گا۔

پیران پیر کی ریاضت

اس سلسلہ میں ہم طبقہ صوفیاء کی آفتاب و ماہتاب ہستی شیخ عبدالقادرؒ کے واقعات پیش کریں گے۔

اور ان کے سیرۃ نگار، محقق ضیاء اللہ قادری کی کتاب سیرۃ غوث الثقلین سے اقتباس پیش کریں گے، یہ بھی خیال رہے کہ اس کتاب کے ابتداء میں نو ایسے مشہور مشائخ عظام و علمائے کرام کی تقاریظ بھی درج کی گئی ہیں جنہوں نے اس کتاب کو ایک تحقیقی کتاب قرار دے کر بہ نظر استحصان خامہ فرسائی فرمائی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عبدالقادر جیلانیؒ کو غوث الثقلین کہا جاتا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ "ثقلین" سے مُراد انسان اور جن ہیں نہ کہ انسان اور فرشتے یا فوت شدہ انسانوں کی رُوحیں۔ چنانچہ قادری صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۸ پر ایک عنوان "جنوں پر حکومت" قائم کر کے اس اشتباہ کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو یہ جنات پر حکومت کیسے ملی۔ اس کے متعلق قادری صاحب "سیرت غوث الثقلین" کے صفحہ ۱۲۰ پر لکھتے ہیں:

"حضرت کو نفسانی خواہشات کے علاوہ شیاطین اور جنات کے ساتھ بھی سخت مقابلہ سے سینہ سپر ہونا پڑا" چند ایک واقعات ملاحظہ فرمائیں:

۱ شیخ عثمان الصیرفینی فرماتے ہیں کہ میں نے غوثِ اعظم کی زبان سے سُنا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "میں شب و روز بیاباں[لہ] اور ویران جنگلوں میں رہا کرتا تھا، تو میرے پاس شیاطین مسلح ہو کر ہیبتناک صورتوں میں صف بہ صف آتے اور مجھ سے مقابلہ کرتے مجھ پر آگ پھینکتے مگر میں اپنے دل میں بہت زیادہ ہمّت اور طاقت محسوس کرتا اور غیب سے کوئی مجھے پکار کر کہتا۔ اے عبدالقادر! اُٹھو، اُن کی طرف بڑھو۔ مقابلہ میں ہم تمہیں ثابت قدم رکھیں گے۔ پھر جب میں ان کی طرف بڑھتا، تو وہ دائیں بائیں یا جدھر سے آتے اسی طرف بھاگ جاتے۔ ان میں سے کبھی میرے پاس صرف ایک شخص ہی آتا اور ڈراتا اور مجھے کہتا کہ یہاں سے چلے جاؤ، تو میں اسے ایک طمانچہ مارتا، تو وہ بھاگتا نظر آتا۔ پھر میں لاحول پڑھتا، تو وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۸۵، ۸۶۔ قلائد الجواہر، ص ۱۱)

پیرانِ پیر کی مجلس میں رجالُ الغیب کی حاضری

قادری صاحب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۹۶ پر رقمطراز ہیں

۱ "حافظ ابو زرعہ طاہر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں غوث پاک کی مجلس میں حاضر تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

لہ ابو السعد حریمی بیان کرتے ہیں کہ غوث پاک نے فرمایا ہے کہ: "میں نے ریاضت و مجاہدہ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں چھوڑا جس کو اپنے نفس کے لئے نہ اپنایا ہو اور اس پر قائم نہ رہا ہوں۔ مدتِ مدید تک میں شہر کے ویران اور بے آباد مقامات پر زندگی بسر کرتا رہا۔ نفس کو طرح طرح کی ریاضت اور مشقت میں ڈالا۔ پچیس برس تک عراق کے بیاباں جنگلوں میں تنہا پھرتا رہا۔ (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۸۳)

"کہ میرا کلام رجالُ الغیب سے ہوتا ہے، جو کوہ قاف سے میری مجلس میں شرکت کے لئے حاضر ہوتے ہیں"
شیخ عبد القادرؒ کے اس دعوے کی تصدیق اُن کے فرزندِ ارجمند شیخ عبد الرزاق ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "حضورؒ کے فرمان کے وقت جب میں نے اُوپر نظر اٹھا کر دیکھا، تو ہوا میں رجال الغیب کی صفوں کی صفیں[1] نظر آئیں اور ان سے تمام اُفق بھر پور تھا اور یہ لوگ سروں کو جھکاتے ہوئے غوث پاک کا کلام سُن رہے تھے۔"
(قلائد الجواہر، ص ۵۸)

۲ "ابُوالغنائم حسینی سے مروی ہے کہ میں ایک دن مغرب اور عشاء کے درمیان مدرسہ کی چھت پر شیخ عبد القادرؒ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھا، اس کا لباس سفید اور نہایت ہی عمدہ عمامہ باندھے ہوئے تھا۔ وہ آپ کی خدمت میں مؤدب بیٹھا اور سلام عرض کر کے چلا گیا، تو میں نے حضرت کے مبارک ہاتھ کو بوسہ دے کر پوچھا: "یہ کون شخص ہے؟" آپ نے فرمایا: "یہ رجال الغیب سے تھا، جو کہ ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں۔" (قلائد الجواہر، ص ۶۸)

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ان جنوں یا رجال الغیب کو مسخر کرنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ ان سے کیا کام لیتے تھے اور کیسے؟ چنانچہ قادری صاحب (کی کتاب سیرۃ غوث الثقلین، صفحہ ۹۵ تا ۱۰۵) کی مندرجہ ذیل دو مرویات ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں:

جنات سے لڑکی واپس لانا

ابوسعید عبد اللہ ۵۳۷ھ کا اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میری فاطمہ نامی غیر شادی شدہ سولہ سالہ لڑکی کو چھت سے کوئی جن اٹھا کر لے گیا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں یہ واقعہ غوث الثقلین کو بتایا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "تم بغداد کے محلہ کرخ کی ویران جگہ میں پانچویں ٹیلہ کے قریب جا کر بیٹھ جاؤ اور اپنے اردگرد زمین پر دائرہ کھینچ لینا اور دائرہ کھینچتے وقت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ عَلٰی نِیَّۃِ عَبْدِ الْقَادِرِ پڑھنا جب آدھی رات گزرے گی، تو تمہارے پاس سے مختلف صورتوں میں جنات گزریں گے، تم ان سے بالکل

[1] صوفیاء کی تاریخ میں اور بھی بہت سے ولی اللہ ہیں جنہوں نے جنات کو تسخیر کر رکھا تھا اور ان سے مختلف کام لیتے تھے۔ مثلاً عبد القدوس گنگوہی، غوث محمد گوالیار، عبد اللہ شاہ بلوچ وغیرہ۔ ان کا ذکر آگے چل کر مختلف عنوانات کے تحت آئے گا۔ پیرانِ پیر کی زندگی ہی میں خواجہ مودود چشتی کی وفات پر اُن کی نمازِ جنازہ سب سے پہلے رجالُ الغیب نے ہی پڑھی تھی، پھر آدمیوں نے اور ان کا جنازہ اُٹھنے بھی لگا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۰)

نہ ڈرنا۔ پھر صبح کو جنوں کے بادشاہ کا ایک عظیم لشکر کے ساتھ تمہارے پاس سے گزر ہوگا۔ وہ تم سے تمہاری ضرورت دریافت کرے گا، تو اسے صرف یہ کہنا کہ مجھے عبدالقادر نے بھیجا ہے۔ بعدازیں اپنی بیٹی کا واقعہ بیان کرنا۔" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جنوں کے بادشاہ نے جب آپ کا نام سنا، تو گھوڑے سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا اور پوچھا: حضرت نے تمہیں کس لئے بھیجا ہے۔ میں نے مقصد بیان کیا، تو اس نے اپنے لشکر سے پوچھا کہ اس لڑکی کو کون اٹھا لایا ہے؟ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بعدازاں ایک سرکش جن حاضر کیا گیا، جس کے پاس لڑکی تھی۔ جنات نے بتلایا کہ یہ جن چین کے جنات میں سے ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: "تجھے کیا ہوا کہ قطبِ وقت کے شہر سے لڑکی اٹھالی؟" جن نے جواب دیا: "کہ یہ مجھے اچھی لگی تھی۔" بادشاہ نے حکم دیا کہ اسی وقت اس کا سر قلم کر دیا جائے، چنانچہ اس کی گردن اڑا دی گئی اور لڑکی میرے حوالے کر دی گئی۔ میں (یعنی ابوسعید عبداللہ راوی) نے کہا کہ مجھے آج سے پہلے جنات کا غوثِ اعظم کی تابعداری کرنے کا علم نہ تھا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۷۱، ۷۰۔ قلائد الجواہر، ص ۳۱، ۳۲۔ نزہتہ الخاطر، ص ۶۲۔ تحفہ قادریہ، ص ۶۸۔ سفینۃ اولیاء، ص ۶۲،۶۷۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۹۵)

اور صاحب خزینۃ الاصفیاء نے یہ اضافہ بھی فرما دیا:

"کہ اس جنوں کے بادشاہ نے کہا: "ہم ان (پیران پیر) کے فرمانبردار کیوں نہ ہوں۔ جب وہ گھر میں تمام جنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ان کی ہیبت سے جنات تھرا اٹھتے ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء اردو ترجمہ، ص ۱۵۶)

اب دیکھئے اس واقعہ کو چھ تذکرہ نگاروں نے بیان فرمایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بڑی معتبر ہے مگر ہمیں تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جب ابوسعید عبداللہ راوی کی لڑکی چھت سے غائب ہوئی، تو ابوسعید کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اسے ضرور کوئی جن ہی اٹھا کر لے گیا؟ جن تو غیر مرئی مخلوق ہوتے ہیں۔ پھر اگر اسے یہ ظن غالب ہو ہی گیا تھا، تو بھی اس کو اس وقت تک یہ تو معلوم نہ تھا کہ جن بھی شیخ عبدالقادر کی تابعداری کرتے ہیں۔ پھر وہ آپ کے پاس جن کے لڑکی اٹھانے کی شکایت لے کر کیسے چلا گیا؟ تاہم اس واقعہ سے چند اور امور پر روشنی ضرور پڑتی ہے، مثلاً:

۱۔ پیرانِ پیر نے بھی جنوں کو مسخر کرنے اور ان سے کام لینے کے وہی طریقے پیش کئے جو آجکل کے جنوں کے عامل کیا کرتے ہیں۔

۲۔ جن خواہ چین کے ہوں یا بغداد کے سب کا بادشاہ ایک ہی ہوتا ہے۔

۲۔ پیرانِ پیر کے زمانہ میں جنوں میں کافرانہ حکومت اور جنگل کا قانون رائج تھا۔ ورنہ جن بھی شریعت کے مکلف ہیں اور جرم اور اس کی سزا کے شرعی تقاضوں کے پابند ہیں۔

آسیب کے دورے

"ایک دفعہ ایک اصفہانی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "میری بیوی کو آسیب ہے اور کثرت سے اس کو دورے پڑتے ہیں۔ تمام عامل عاجز آگئے ہیں"، تو حضرت نے ارشاد فرمایا: "کہ یہ سراندیپ کے بیابان کا خانس نامی جن ہے۔ اب جب تمہاری بیوی کو دورے کی شکایت ہو، تو اس کے کان میں کہنا "اے خانس! عبدالقادر، جو کہ بغداد شریف میں مقیم ہیں۔ اُن کا فرمان ہے کہ سرکشی نہ کر۔ آج کے بعد اگر آئندہ آیا، تو ہلاک کر دیا جائے گا۔" اس کے بعد وہ شخص اصفہان چلا گیا پھر دس برس بعد آیا، اور عرض کیا کہ آپ کے فرمان کے بعد کبھی میری بیوی کو دورے کی شکایت نہیں ہوئی۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۷۱، قلائد الجواہر ص ۳۲، سفینۃ الاولیاء ص ۴۷، تحفہ قادریہ، ص ۶۸)

یہ واقعہ بھی چار تذکرہ نگاروں نے بیان فرما کر اس کے نہایت معتبر ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ موجودہ طبی تحقیق تو یہ ہے کہ ایسے دورے شادی شدہ عورت کو نہیں پڑتے بلکہ جوان اور کنواری عورت کو پڑتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اصفہانی خود نامرد ہو۔ تاہم یہ مان لیتے ہیں کہ یہ واقعہ چار شہادتوں کی وجہ سے بالکل درست ہے۔ اب اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ جب جنوں کے دوسرے عامل عاجز آجاتے، تو عبدالقادر جیلانی کے پاس آتے تھے، کیونکہ آپ سب سے اونچے درجہ کے جنات کے عامل تھے۔ مزید تفصیل باب ہفتم، زیرِ عنوان "اولیاء اللہ کا مقابلہ" میں دیکھئے۔

WWW. DEENEKHALIS. COM
WWW. RAHEHAQ. COM
WWW. ESNIPS. COM/USER/TRUEMASLAK

یہ کتاب خرید کر اسلام کی سچی تعلیمات کے فروغ میں مکتبہ السلام کا ساتھ دیجئے۔

باب (۵)

صُوفیائے کے مخصُوص مسائل (۲)

۹۔ شیعیّت سے لگاؤ

یہ تو شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارے ہاں دینِ طریقت کے مروجہ چاروں سلسلے قادری، نقشبندی، چشتی سُہروردی۔ اور اسی طرح کئی غیر ملکی سلسلے بدوی، رفاعی اور یونسی وغیرہ بھی[1]۔ اپنے شجرۂ طریقت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملاتے ہیں اور بزعم خود انہیں علومِ باطنی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ عبداللہ بن سبا یہودی نے ظاہر اور باطن کا یہ گمراہ کُن عقیدہ جس چابکدستی سے اسلام میں داخل کیا، وہ بھی ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور یہ بھی کہ ہی عبداللہ بن سبا کے پیروکار شیعانِ علی کے نام سے موسوم ہوتے اور انہی لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں حلول کا عقیدہ اپنایا۔ یہ باطنیت کے اثرات اور اسی وجہ سے دینِ طریقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور شیعیت سے لگاؤ کا عقیدہ آج تک پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ وہ روایات ہیں جو تذکروں اور ملفوظات میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند روایتوں کا ہم یہاں ذکر کریں گے:

۱۔ بارہ اماموں کا فیض

ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۱۰۹ اور صفحہ ۲۲۱ پر رقمطراز ہیں کہ:

"حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وصال سے قبل اس مقام ولایت کے ملجا و ماویٰ تھے اور جس کسی کو اس طریقہ سے فیض پہنچتا تھا، ان ہی توسط اور توسل سے پہنچتا تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا، تو یہ بلند درجہ کا منصب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو بالترتیب حاصل ہوا۔ ان کے بعد بالترتیب بارہ اماموں کو پہنچتا رہا اور اس طرح ان بزرگوں کے وصال کے بعد جس کسی

---

[1] فی الحقیقت ان سلسلوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے دائرۃ المعارف الاسلامیہ زیرِ عنوان طریقت۔

کو فیض پہنچتا ہے۔ ان ہی کے توسل سے پہنچتا ہے اور بعدازاں جتنے بھی اقطاب اور نجبائے وقت ہوتے ہیں۔ اُن کے ملجا و ماویٰ بھی وہی ہوتے ہیں، کیونکہ اطراف کو لامحالہ مرکز سے ملنا ہی پڑتا ہے۔ تاآنکہ نوبت سید عبدالقادر جیلانی تک پہنچی اور یہ مرتبہ آپ کو مل گیا۔ بارہ اماموں اور حضرت شیخ کے درمیان کوئی شخص اس مرتبہ پر نہیں ہے۔ اب اس راستے سے فیوض و برکات جتنے اقطاب، نجباء اور ولیوں کو پہنچتی ہیں، ان کے ذریعے پہنچتی ہیں، کیونکہ فیض کا یہ مرکز ان کے بغیر کسی کو نہیں ملا۔ اسی جگہ غوث پاک نے فرمایا کہ:

اَفَلَتْ شُمُوسُ الْاَوَّلِیْنَ وَشَمْسُنَا ۔۔۔ اَبَدًا عَلٰی اُفُقِ الْعُلٰی لَاتَغْرُبُ

یعنی پہلے ولیوں کے سورج ڈوب گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ افق بلند پر رہے گا، جو کبھی نہ ڈوبے گا۔

(المکتوبات، ج ۳، نمبر ۱۲۳)

مجدد الف ثانی کے درج بالا اقتباس میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں:

۱ عبدالقادر جیلانی کا شجرہ طریقت آٹھویں امام علی موسیٰ (م ۲۰۳ھ) کے بعد معروف کرخی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ باقی چار اماموں کا کہیں ذکر نہیں۔ (حوالے کے لئے دیکھئے اسی کتاب سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹ پر غوث پاک کا شجرہ طریقت و خلافت)

۲ خود مجدد الف ثانی نقشبندی بھی ہیں اور اُن کا شجرہ طریقت چھٹے امام جعفر صادق (م ۱۴۹ھ) سے بایزید بسطامی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ باقی چھ اماموں کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم آپ نے پورے بارہ اماموں کا ذکر کرکے شیعہ حضرات کے فرقہ اثنا عشریہ سے لگاؤ کا پورا ثبوت مہیا فرمادیا ہے۔

۳ اگر مرکز فی الواقعہ یہ بارہ امام ہی ہیں تو طریقت کے سارے کے سارے سلسلے اس مرکز کو چھوڑ گئے ہیں اور چشتی حضرات تو اپنا شجرہ طریقت حضرت علی رضی اللہ عنہ (م ۴۰ھ) سے یک لخت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کو بھی محدثین تسلیم نہیں کرتے۔

۴ اس دُنیائے طریقت میں عبدالقادر جیلانی سے پہلے کے کئی حضرات کے سورج طریقت کے آسمان پر آج تک چمک رہے ہیں۔ مثلاً معروف کرخی، سری سقطی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، منصور حلاج، حسن بصری، ابراہیم ادھم، بایزید بسطامی وغیرہ وغیرہ، کیا اُن سب کے سورج ڈوب چکے ہیں؟

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے درویش تھے

خواجہ فریدالدین گنج شکر واقعہ معراج پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پھر کچھ خرقہ کا ذکر ہونے لگا۔ آپ (خواجہ فرید الدین گنج شکر) نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی شبِ معراج میں خرقہ ملا تھا اور آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے خرقہ پایا ہے۔ مجھ کو حکم ہے کہ میں تم سے اسے کسی کو دوں۔ اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ جو شخص تم میں سے جواب باصواب دے گا، میں یہ خرقہ اسے دوں گا۔ اوّل آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ خرقہ تجھ کو دوں، تو تو کیا کرے؟ کہا: یارسول اللہ ﷺ! میں صدق اختیار کروں اور خدا کی بندگی کروں اور جو کچھ میرے پاس مال ومنال ہو، وہ سب اللہ کی راہ میں دوں۔ پھر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہا، میں عدل کروں اور بندگانِ خدا کے ساتھ انصاف کروں اور مظلوموں کی داد دوں۔ پھر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہا، میں ایک دوسرے میں اتفاق کی کوشش کروں۔ پھر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا، کہ میں پردہ پوشی کروں اور خدا کے بندوں کے عیب چھپاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "اے علی رضی اللہ عنہ لے یہ خرقہ میں نے تجھ کو دیا۔ مجھ کو حضرت ربُّ العزّت کا فرمان بھی یہی تھا کہ جو تیرے یاروں سے یہ جواب دے، اسی کو یہ خرقہ دیجئے۔"

"یہ حکایت فرما کر شیخ الاسلام آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ہائے ہائے کر کے رونے لگے اور بیہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے، تو یہ لفظ مبارک زبان پر لائے کہ 'معلوم شد درویشی پردہ پوشی است' یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ درویشی کے معنی یہی ہیں کہ بندگانِ خدا کی پردہ پوشی کرے۔" (راحۃ القلوب، ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیا، مترجم غلام احمد بریاں، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۳۸)

اس حکایت سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔

۱۔ معراج جیسا مشہور واقعہ تقریباً سب محدثین نے ذکر کیا، لیکن اس عظیم الشان خرقہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہ شاید اہلِ باطن پر ہی القا ہوا ہو۔

۲۔ اس امت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے درویش، پردہ پوش اور خرقہ پوش تھے۔

۳۔ یہ کہ صدق اور صدقہ، عدل وانصاف اور اصلاح بین المسلمین یہ سب اعمال پردہ پوشی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ پہلے تین خلفاء کے جواب کا خرقہ سے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ حضرت علی شاید لوگوں کے عیوب پر یہ خرقہ ڈال کر پردہ پوشی فرما لیتے ہوں۔

۳۔ جُبّہ نبویؐ کی تاریخ

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ عبدالعزیز قادری مصنف سرچشمہ حیات کے بیان کے مطابق (بحوالہ حقیقت گلزار صابری)
حضور اکرم ﷺ نے پانچ سال قبل از ہجرت پندرہ ممالک کا باطنی انتظام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا تھا۔ اور ارشد اویسی صاحب مصنف الاولیس کے بیان کے مطابق حضور اکرم ﷺ نے بوقتِ رحلت اپنا جُبّہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی علیہ السلام کے حوالہ کر کے فرمایا: "کہ وہ اسے خواجہ اویس قرنی کو پہنچا ئیں اور ان سے اُمت کی بخشش کے لئے دُعا کرائیں۔ چنانچہ ان دونوں صحابہ کرام نے بڑی جستجو کے بعد دس سال بعد آخر خواجہ اویس کو آخر تلاش کر ہی لیا اور جُبّہ مبارک ہدیہ کیا اور اُمت کی بخشش کے لئے درخواست کی۔ پھر یہی جُبّہ مبارک حضرت علیؓ کے پاس واپس آگیا۔ یہ کیسے واپس آیا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ جب فرات میں طغیانی آئی تھی اور کوفہ کے لوگوں نے آپ سے اس بات کی شکایت کی تھی تو حضرت علیؓ نے یہی جُبّہ پہن کر دریائے فرات کے کنارے پہنچ دو رکعت نماز ادا فرمائی تھی (خزینۃ الاصفیا ص ۶۱) پھر ہوتے ہوتے یہی جُبّہ قلعہ لاہور پہنچ گیا تھا چنانچہ آج کل اسی مقام پر ہے۔ (حدیقۃ الاولیاء ص ۲۴۶)

۴۔ ماتم اور تعزیہ داری کی اہمیت

خواجہ فریدالدین سے متعلق دوسرا واقعہ بھی دورِ نبوی کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جو ماتم اور تعزیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ "پھر آپ (خواجہ فریدالدین گنج شکر) نے اس موقعہ پر فرمایا کہ ایک دفعہ رسولِ خدا ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید کو کندھے پر بٹھائے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ رسولِ خدا ﷺ نے تبسم کیا اور فرمایا: سبحان اللہ! دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہوئے جا رہا ہے۔ جب یہ کلمہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے سنا، تو حال پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ تو معاویہؓ کا لڑکا ہے۔ دوزخی کہاں سے ہے؟ کہا اے علی رضی اللہ عنہ یہ یزید وہ بدنصیب لڑکا ہے۔ جو میرے حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور میری ساری آل کو شہید کرے گا۔ حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہوگئے اور تلوار نیام سے نکال لی کہ میں اسے مارے ڈالتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ! ایسا نہ کرو۔ خدا کا حکم ایسا ہی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام رونے لگے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ﷺ! اس وقت آپ سر پر ہوں گے؟ فرمایا: نہیں! کہا یاروں میں سے کوئی ہوگا؟ کہا نہیں! کہا کیا میں ہوں گا؟ کہا نہیں! کہا، فاطمہ ہوں گی؟ کہا وہ بھی نہیں۔ کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے بچوں کی کون ماتم داری کرے گا۔ کہا "میری اُمت

" پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں گریہ کرنے لگے اور دونوں شاہزادوں سے بغلگیر ہوئے اور نعرہ مارا کہ میں نہیں جانتا کہ اس دشت (کربلا) میں تمہارا کیا حال ہوگا۔"

"اس کے بعد شیخ الاسلام زبان مبارک سے فرمانے لگے کہ جس روز امیر المؤمنین حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اس رات ایک بزرگ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا کہ آپ کل انبیائؑ کی بیویوں کو ساتھ لائی ہیں۔ دامن کمر مبارک سے بندھا ہوا ہے۔ دشتِ کربلا میں جہاں کہ امیر المؤمنین حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہادت پا دیں گے، جھاڑو دے رہی ہیں اور اپنی آستین مُبارک سے صاف کرتی جاتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ: "اے خاتونِ قیامت اور اے بنتِ شفیع روزِ محشر! یہ کیا مقام ہے جسے آپ اپنی آستین سے صاف کر رہی ہیں؟" فرمایا: "یہ وہ مقام ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ میرا بیٹا یہاں سر دے گا اور شہادت پائے گا۔"

"اس کے بعد اسی موقع پر آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے یہ حکایت پوچھی کہ جب ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا، تو کون ان کی تعزیت کرے گا؟ کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی اُمت آپ کے فرزندوں کی تعزیت کرے گی اور ایسی ماتم داری کرے گی کہ اس کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔" (راحۃ القلوب، ص ۲۰۶، ۲۰۷، ملفوظات خواجہ فریدالدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاؒ، ترجمہ غلام احمد بریاں، مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۹۱۶ء)

اس بیان سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱ مندرجہ بالا بیان شیخ الاسلام کی تاریخ وجغرافیہ دانی کا ایسا نادر شاہکار ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً:

ا ___ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید کو کندھے پر اٹھائے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نکلے حالانکہ یزید تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوتے تھے۔ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے پندرہ سال بعد ۲۶ھ میں خلافتِ عثمان کے دور میں پیدا ہوتے تھے، تو پھر بہشتی کے کندھے پر دوزخی کا کیا سوال؟

ب ___ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں شہزادوں سے بغل گیر ہوئے اور فرمایا میں نہیں جانتا دشت میں تمہارا کیا حال ہوگا۔" حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ واقعہ کربلا ۶۱ھ سے گیارہ

سال پہلے ۲۰ صفر ۵۰ھ کو وفات پا چکے تھے۔

ج۔ جب آپ کی ساری آل کو یزید نے دشتِ کربلا میں شہید کر دیا تھا، تو یہ اتنے کثیر تعداد میں سید کہاں سے تشریف لائے۔

د۔ دشتِ کربلا تو ریت کا میدان تھا، وہاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کیا جھاڑ دے کر ریت کے تودے ہٹائے تھے۔

ر۔ امیر المؤمنین کوئی اعزازی لقب نہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین کیسے ہو گئے جبکہ ان کی خلافت ایک لحہ کے لئے بھی منعقد نہیں ہوئی۔

۲۔ اسی طرح یہ بیان شیعہ نوازی کا بھی شاہکار ہے۔ یزیدؒ کو دوزخی قرار دینا۔ وقوعہ شہادت سے پہلے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گریہ وزاری کرنا۔ پھر زبانِ نبوت سے اُمت کی طرف سے تعزیہ اور ماتم داری کا اعلان۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے خود خدا کا اعلان کہ یہ ماتم داری صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ایک اچھی صفت ہے۔ یہ سب باتیں شیعیت کی پوری پوری تائید کر رہی ہیں۔

۵۔ جنّوں کا ماتم

مفتی غلام سرور صاحب لاہوری، مصنف خزینۃ الاصفیاء اس کتاب کے صفحہ ۵۸ پر رقمطراز ہیں کہ:

"جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا، تو جنات نے تین دِن تک مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی چھت پر ماتم کیا اور آپ کے مرثیہ میں ابیات پڑھتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو تین روز تک دفن نہ کیا گیا۔ ناگاہ ہاتف نے آواز دی: "اُدْفُنُوْہُ وَلَا الصَّلٰوۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ" یعنی انہیں دفنایا جائے اور نماز جنازہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس محبوب کا جنازہ ادا کر دیا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۸)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ جنات کے کرنے کا کام تو یہ تھا، کہ ان غنڈوں کا جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، گلا گھونٹ دیتے یا کم از کم شہید کرنے کے بعد ہی ان کی خبر لیتے، لیکن انہوں نے بھی کیا کم ہمتی دکھائی کہ بس ماتم پر ہی مطمئن ہو گئے اور یہ بد رسم امتِ محمدیہ میں چھوڑ دی۔ جس کو عملاً شیعہ حضرات نے اور عقیدتاً صوفیاء نے تسلیم کر لیا۔

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفن کا انحصار ہاتف کی ندا پر تھا۔ اگر یہ ندا دو دن پہلے آجاتی تو آپ دو دن پہلے دفن ہو جاتے اور غنیمت سمجھئے کہ تین دن بعد یہ ہاتف کی ندا آگئی۔ اگر ایک ماہ بعد ندا آتی، تو میت کا جو حال ہوتا وہ معلوم ہے۔ لہٰذا ہمیں اس ہاتف کی آواز کا مشکور ہونا چاہئے۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرامت نگار تاریخ کے پس منظر سے بالکل بیگانہ ہو کر ہر طرح کے واقعہ کو رجالُ الغیب، ندائے غیبی کے ذریعے اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ رہی عربی زبان کی فصاحت تو وہ بھی قابل داد ہے۔

۶۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور حوضِ کوثر

"مولانا جامی (م ۸۹۸ھ) اپنی کتاب شواہد النبوت میں فرماتے ہیں:

"ایک نیک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حوضِ کوثر کے پاس کھڑے ہیں اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما دائیں بائیں کھڑے مخلوقِ خدا کو پانی پلا رہے ہیں۔ میں نے بھی پانی کی درخواست کی، تو فرمایا: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر پانی نہیں مل سکتا۔" آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا: "تمہیں پانی نہیں مل سکتا، کیونکہ تمہارے ہمسایہ میں ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتا ہے اور تم منع نہیں کرتے۔" میں نے عرض کی کہ "مجھے ڈر ہے کہ اگر میں منع کروں، تو مجھے قتل نہ کر دے۔" آپ نے مجھے ایک تیز چھری دی کہ اس سے دشمن علیؓ کا کام تمام کر دو۔" میں نے چھری لی اور آکر اس دشمن مولا علیؓ کو قتل کر کے آپ کو جا کر اطلاع دی، تو آپ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے فرمایا: "اسے آبِ کوثر دے دو اس نے حقِ محبتِ علی ادا کر دیا ہے۔" میں نے پیالہ لیا مگر یاد نہیں کہ پی سکا کہ نہیں کہ میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہوئی، تو باہر شور برپا تھا کہ فلاں شخص کو کسی نے بستر میں ہی قتل کر دیا ہے۔ صبح پولیس آئی اور بے گناہ ہمسایوں کو گرفتار کر لیا۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ! کیا خواب ہے۔ بے گناہ ہمسائے گرفتارِ مصیبت ہو گئے۔ انہیں بے گناہ قید و بند میں رکھنا دین کے خلاف ہے۔ میں نے قاضی شہر کے پاس جا کر اپنے قتل کا اعتراف کر لیا اور رات کا واقعہ سنا کر کہا کہ یہ لوگ بے قصور ہیں، انہیں رہا کر دیا جائے۔" اس نے کہا: "تم بھی اس مقدمہ میں بے گناہ ہو، مقتول اپنی سزا کو پہنچ گیا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۰)

مولانا عبدالرحمٰن جامی صاحب کی شواہد النبوت کی یہ روایت کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے۔ مثلاً:

۱ حوضِ کوثر سے پانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پلائیں گے۔ اس میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا کوئی واسطہ نہیں۔

۲۔ خود آپؐ کو غیب کا حال معلوم نہ ہوگا۔ حوضِ کوثر کی طرف آنے والے بعض مسلمانوں کو فرشتے دھکیل رہے ہوں گے۔ آپ (ﷺ) فرشتوں سے اس کی وجہ پوچھیں گے، تو فرشتے کہیں گے کہ "آپ کو خبر نہیں کہ آپ ﷺ کے بعد ان لوگوں نے کیا بدعات جاری کیں۔" (مسلم) تو آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں شخص دشمنِ علیؓ ہے۔ اور یہ پانی کا ساتل اپنے اس دشمنِ علی ہمسایہ کو بُرا بھلا کہنے سے منع نہیں کرتا۔

۳۔ خواب حضورِ اکرم ﷺ کو بھی آیا تھا کہ وہ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سمیت عُمرہ کر رہے ہیں، لیکن یہ خواب کا عمرہ دو سال بعد واقعاتی دنیا میں وقوع پذیر ہوا تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔" لیکن اس "نیک شخص" کا خواب اُسی وقت اِس واقعاتی دنیا میں اس کے جاگنے سے پہلے رُونما ہوگیا۔ شاید یہ شخص رسول اکرم ﷺ سے بھی زیادہ پہنچا ہوا ہو۔

۴۔ پولیس بھی عجب بدھو قسم کی تھی۔ دشمنِ علی کے قتل کا شبہ تو کسی مُحبِ علی نیک آدمی پر ہی ہو سکتا تھا اس نے دوسرے ہمسایوں کو خواہ مخواہ قید و بند میں ڈال دیا۔ البتہ اس لحاظ سے باشعور بھی تھی کہ اس خواب کے حوادثات کو عدالت کی بنیاد قرار نہ دے کر اس "نیک شخص" کو بھی چھوڑ دیا۔

۵۔ یہ سارا قصہ آبِ کوثر کے پیالہ پینے کے گرد گھومتا ہے اور یہی بات اس "نیک آدمی" کو یاد نہ رہی کہ پیالہ پیا یا محروم ہی رہا، پھر اس قصہ کا فائدہ ہی کیا تھا؟

بہر حال ہم جامی صاحب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے حُبِ علیؓ کی تائید کے سلسلے میں ایسا لاجواب افسانہ تراشا ہے۔

۷۔ حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا اور خونِ کربلا

"حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا اُمّ المومنین بیان فرماتی ہیں کہ ایک رات آپ کافی دیر سے گھر آئے۔ پریشان حال، غبار آلود اور تھکے تھکے دکھائی دیتے تھے اور ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ میں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ اور آپ اس حال میں کیوں ہیں؟" فرمایا: "آج مجھے کربلا لے جایا گیا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقتل ہوگا۔ مجھے اپنی اولاد کے دوسرے افراد بھی دکھائے گئے (جو ابھی پیدا بھی نہ ہوتے تھے) میں اس زمین پر پڑا ہوا خون اکٹھا کر کے لے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے ہاتھ کھول کر مجھے فرمایا: "اس سرخ مٹی کو اپنے پاس محفوظ کر لو۔" میں نے یہ سرخ مٹی ایک شیشی میں ڈال کر

منہ کو خوب بند کر دیا۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ سفرِ عراق کو روانہ ہوئے، میں ہر روز اس شیشی کو دیکھا کرتی اور رویا کرتی۔ محرم کی دسویں تاریخ، شام کو میں نے دیکھا کہ وہ مٹّی خون بن گئی ہے، مجھے معلوم ہو گیا کہ آج حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۷۴)۔

یہ "حدیث" چونکہ بلا حوالہ اور بے سند ہے، لہٰذا موضوع اور مَردُود ہے۔ پھر کئی لحاظ سے محلِ نظر بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ میدان کافی رات گئے کیوں دکھایا گیا؟ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ آپ اس طرح کے نور تھے کہ آپ کے جسم سے روشنی پھوٹتی تھی۔ بلکہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ رات کو آپ کے ہاں بھی چراغ جلتا اور بجھتا تھا۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ثابت ہے۔ پھر آپ کو اشخاص بھی ایسے دکھائے گئے، جو ابھی پیدا بھی نہ ہوتے تھے اور آپؐ انہیں جانتے بھی نہ تھے۔ اس رات کے اندھیرے میں آپؐ نے انہیں کیا دیکھا ہو گا؟

پھر آپؐ نے کربلا کے میدان سے اکٹھا تو خون کیا تھا، مگر گھر آنے تک وہ سُرخ مٹّی میں تبدیل ہو گیا یہ تبدیلی اس لئے کی گئی کہ اگر کرامت تراش اس خون کو پہلے سُرخ مٹّی نہ بناتے، تو اگلی کرامت کی بنیاد نہیں بن سکتی تھی۔

۸۔ حضرت زین العابدینؒ کو امامت کیسے ملی؟

"حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد محمد بن حنفیہ (جو حضرت علیؓ کی بیوی حنفیہ کے بطن سے تھے) اور زین العابدین (ابنِ حسین رضی اللہ عنہ) میں امامت کے متعلق جھگڑا ہوا۔ محمد بن حنفیہ کہتے تھے، میں بڑا ہوں، لہٰذا امامت میرا حق ہے اور زین العابدین کہتے تھے کہ میں اہلِ بیت سے ہوں، لہٰذا امامت میرا حق ہے۔ آخر زین العابدینؒ نے کہا کہ چلو حجرِ اسود سے فیصلہ کرواتے ہیں۔ دونوں حجرِ اسود کے سامنے پیش ہوئے۔ پہلے محمد بن حنفیہ نے اپنا دعوٰے پیش کیا، لیکن حجرِ اسود خاموش رہا۔ پھر جب زین العابدین نے دعوٰی پیش کیا، تو حجرِ اسود زور سے ہلا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جگہ سے نکل آئے گا۔ پھر فصیح زبان میں کہا: "اللہ تعالٰے نے امامت اور ولایتِ باطنی کا حق تو زین العابدین کو دیا ہے دوسرا کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔" یہ فیصلہ سنتے ہی محمد بن حنفیہ اپنے حق سے دستبردار ہو گئے۔

خزینۃ الاصفیاء، ص ۹)

حجرِ اسود کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مخاطب کر کے کہا تھا کہ "میں خوب جانتا ہوں کہ تو بے جان پتھر ہے جو نہ کسی کا کچھ سنوار سکتا

ہے، نہ بگاڑ سکتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے تمہیں نہ چوما ہوتا، تو میں بھی نہ چومتا۔" اس وقت حجرِ اسود کچھ نہ بولا۔ لیکن حکم بن کر بلند آواز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پوتے کو ہی اہل بیت اور امامت کا مستحق قرار دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو امامت اور ولایت باطنی سے محروم کر دیا۔ اور اس طرح اہل بیت کی طرفداری کا ثبوت مہیا کر دیا۔

۹۔ اشرف علی تھانوی کی پیدائش

اشرف علی صاحب تھانوی اپنی پیدائش کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں:

"میں ایک مجذوب کی دعا سے پیدا ہوا ہوں، جن کا نام غلام مرتضیٰ ہے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اس لڑکی، یعنی میری والدہ کی اولاد زندہ نہیں رہتی، تو فرمایا کہ "عمر اور علی کی کھینچا تانی میں ٹوٹ جاتی ہے۔ اب جو اولاد ہو علی کے سپرد کر دینا۔" اس (رمز) کو کوئی نہیں سمجھا۔ میری والدہ، جن کی نسبت سنا ہے، کہ صاحبِ ذوق تھیں، سمجھ گئیں اور کہنے لگیں کہ باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی اور نام بچوں کے والد کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ اب جو اولاد ہو ماں کے خاندان کے نام پر رکھو یعنی اس میں لفظ علی ہو، وہ مجذوب خوش ہوتے اور فرمایا: "یہ لڑکی بڑی ذہین ہے، یہی مطلب ہے۔" نانی صاحبہ نے عرض کیا پھر آپ ہی نام رکھ دیجئے۔" فرمایا: "دو لڑکے ہوں گے، ایک کا نام اشرف علی خان رکھنا اور ایک کا نام اکبر علی خان۔" عرض کیا گیا کہ کیا پٹھان ہیں؟" فرمایا "ہاں ہاں! ایک کا اشرف علی اور ایک کا اکبر علی رکھنا۔ ایک ہمارا ہوگا، وہ حافظ اور مولوی ہوگا اور ایک دنیا دار ہوگا۔ پھر ہم دونوں بھائی پیدا ہوئے۔" (افاضاتِ یومیہ، ص ۲۰۱، ج ۵، بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۲۰۰)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱ مولانا اشرف تھانوی کی والدہ اور نانی دونوں کو اللہ پر توکل نہ تھا اور آج کل کی کمزور عقیدہ والی عورتوں کی طرح ہی تھیں، جو اولاد کے حصول یا زندگی کے لئے پیروں فقیروں کی طرف رجوع فرماتی ہیں۔

۲ مجذوب غلام مرتضیٰ صاحب اسرار و رموز میں بات کیا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے۔

۳ ان مجذوب صاحب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کھینچا تانی کا تو علم ہو گیا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خاندان پٹھان نہیں۔ چنانچہ بعد میں ناموں کی تصحیح بھی فرمائی۔

تصوف پر باطنیت کی چھاپ اور موضوعات

اب حضرت علی اور اہل بیت سے متعلق

ایک حدیث بھی سن لیجئے، جو صوفیاء اور شیعوں میں یکساں مقبول ہے:

مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَسَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَ مَنْ تَخَلَّفَ فَقَدْ غَرِقَ وَ هَوٰى

میرے اہلِ بیت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہے، جو اس میں سوار ہوا نجات پا گیا۔ اور جو پیچھے رہ گیا، غرق ہوا اور گر گیا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں بدلائل یہ بات ثابت کی ہے کہ موجودہ تصوف باطنیت یعنی عبداللہ بن سبا یہودی کی تحریک سے سخت متاثر ہے۔ انہوں نے اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ بے شمار وضعی احادیث شیعوں اور باطنیوں نے وضع کیں، جن کو صوفیاء نے قبول کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے الحاقی مضامین بھی اہلِ تصوف کی تصنیفات میں شامل کر دیتے ہیں۔ وہ اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ: "آخر میں ملا علی قاری کی مشہور کتاب موضوعات سے چند اقتباسات درج کر کے اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔

۱۔ سیرۃ النبی ﷺ کا اولین مصنف ابنِ اسحاق چونکہ شیعہ تھا اس لئے اس نے اکثر ایسی روایتیں بھی درج کر دی ہیں جن سے اس کے مذہب کی تائید ہو۔ مثلاً خیبر کے دروازہ اکھیڑنے کی روایت۔

۲۔ کُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا۔ حدیث نہیں۔ اکثر صوفیاء اسے حدیث سمجھتے ہیں۔ رضی اللہ عنہ

۳۔ تاریخوں میں خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خطبہ نہ دے سکنے کی روایت بھی غلط ہے۔

۴۔ آئمہ حدیث کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حسن بصری (م۔ ۱۱۰ھ) کی ملاقات اور تحصیلِ علم ثابت نہیں۔

۵۔ خرقہ والی حدیث (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) غلط ہے اور معاندینِ صحابہ کی وضع کردہ ہے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمازِ عصر قضاء ہونے پر حضرت رسول اللہ ﷺ کے سورج کو واپس موڑنے کی روایت بھی غلط ہے۔

۷۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا مجمع عام میں فرمانا کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ میرا وصی ہے۔ قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے۔

۸۔ یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے خلاف خروج مت کرنا۔" بے بنیاد ہے۔

۹۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خروج کریں، تو تم نرمی کا برتاؤ کرنا۔" سراسر کذب اور افترا ہے۔

۱۰ یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ باطنی اسرار و علوم سکھائے تھے، جو دوسرے صحابہ کو نہیں سکھائے۔ قطعاً غلط ہے[1]۔

ملا علی قاری کے اس قول پر کہ "روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں ۳ لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" اس اقتباس کو ختم کرتا ہوں۔" (اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۹-۱۲۶)

یہی سلیم چشتی آگے چل کر ایک شیعہ مصنف پروفیسر سید حسین نصر کی ایک انگریزی کتاب "اسلام کے مطامح نظر اور حقائق" سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، مثلاً:

۱۔ منگولوں کے حملے کے دور میں ایران میں تصوف اور اسمٰعیلیت میں اتحاد کی ایک مستقل صورت پیدا ہو گئی تھی، جس کا تحقیقی مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ (ص ۱۶۰)

۲۔ اثنا عشری شیعیت میں مذہب کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کو بالخصوص اہمیت دی گئی ہے اور اس اعتبار سے وہ تصوف کی ہمنوا ہے۔ (ص ۱۶۰)

۳۔ تصوف اور تشیع دونوں کی تعلیم یہ ہے کہ "نورِ محمدی" حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہر نبی کی ذات میں موجود رہا ہے۔ (ص ۱۶۰) (بحوالہ اسلامی تصوف، ایضاً، ص ۱۲۴)

ان اقتباسات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کا موجودہ تصوف باطنیت اور شیعیت کے زیرِ اثر پرورش پاتا رہا ہے۔ اور ہمارے بڑے بڑے بزرگ بھی تحقیق و تفحص کے بجائے محض اکابر کی پیروی کرتے چلے آتے ہیں۔

۱۰۔ خرقہ کی فضیلت

خرقہ[2]، گدڑی یا مرقع ہمارے صوفیا کے خاص شعائر میں سے ایک ہے اور جو چیز صوفیاء سے تعلق

---

[1] صوفیاء میں رائج شدہ موضوع احادیث اور موضوع واقعات کی مزید تفصیل آگے باب 'نہم' میں آئے گی۔

[2] ان لوگوں کا خرقہ اون کا کوئی موٹا سا چادر نما کپڑا ہے۔ کبھی تو اس کی نسبت حضور ﷺ سے کی جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ

بقیہ اگلے صفحہ پر

رکھتی ہو، وہ بہر حال افضل ہی ہونی چاہئے۔ پھر کسی کامل پیر کا کسی کو اپنا خلیفہ بناتے وقت بھی اسے خرقہ عطا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اب اس خرقہ کی فضیلت کا مقام یہ ہے کہ بابا فریدالدین گنج شکر کے کشف کے مطابق شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے خود حضور اکرم ﷺ کو عطا فرمائی تھی۔ یہ خرقہ آپ نے بھی کسی جانشین کو دینا ہی تھا۔ کیونکہ اللہ کا حکم تھا، تو تمام کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا امتحان لینے کے بعد بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نظر انتخاب پڑی، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میں یہ خرقہ لے کر لوگوں کی پردہ پوشی کروں گا۔ اور خدا کا حکم بھی یہی تھا کہ جو اس طرح کا جواب دے خرقہ اُسے ہی دیا جائے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلا خرقہ یہی تھا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملا (اس خرقہ کی تفصیلی روایت کے لئے "حضرت علی رضی اللہ عنہ اور شیعیت سے لگاؤ" کا عنوان دیکھ لیجئے) اب خرقہ کے دیگر فضائل و برکات بھی ملاحظہ ہوں۔

شیر پر خرقہ کا اثر

حضرت ابراہیم بن داؤد رضی اللہ عنہ کے تذکرہ نگار فرماتے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک درویش نے آپ کے پیرہن کا ایک ٹکڑا اپنی گدڑی میں سیا ہوا تھا، وہ جنگل میں جا رہا تھا کہ ایک شیر اس پر حملہ آور ہوا۔ جب اس کی نظر گدڑی پر پڑی تو پلٹ گیا۔ درویش نے سمجھ لیا کہ یہ آپ کے پیرہن کے ٹکڑہ کی حرمت تھی، جو شیر نے جان چھوڑ دی اور چلا گیا۔"

(مقربانِ حق، ص ۱۹۱)

سُلطان محمود غزنوی کی فتح سومنات کا سبب

"نقل ہے کہ جب سلطان محمود نے سومنات پر حملہ کیا، تو چاروں طرف کے ہندو راجے مہاراجے بھاری فوجیں لے کر جمع ہو گئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کفار کا لشکر بے شمار تھا اور کسی طرح مغلوب نہ ہوتا تھا۔ اس عالم میں محمود گھوڑے سے اُترا اور وہ پیرہن، جو حضرت ابُوالحسن خرقانی رحمہ اللہ سے تبرّک کا ساتھ لایا تھا آگے رکھا اور سر بسجود ہو کر یہ دُعا کی: "الٰہی! ہم ناتواں ہیں۔ اس خرقہ درویش کے صدقہ میں فتح دے۔" دُعا مستجاب ہوئی۔ کفار کا لشکر بھاگ نکلا اور محمود فتحیاب ہوا۔ اس نے رات کو خواب میں حضرت ابوالحسنؒ کو دیکھا، جو فرما رہے تھے: "محمود! اتنے ذرا سے کام کے لئے بارہ گاہ الٰہی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

موٹا کپڑا پہننا پسند فرماتے تھے مگر آپ ﷺ روئی کا موٹا کپڑا پہنتے تھے نہ کہ اون کا۔ اور کبھی یہ لوگ اس خرقہ کی فضیلت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہنتے تھے اور کبھی اس کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا

لہ مرشد کامل یا حدائق الاخیار کے مصنف صادق فرغانی محمود غزنوی کی اس فتح کے سبب شیخ لقمان سرخسی کی ایک اور ہی کرامت قرار

باقی اگلے صفحہ پر

میں میرا پیرہن پیش کر دیا۔ اے نادان اگر تو یہ کہتا کہ الٰہی! اس خرقہ کی برکت سے یہ سب کافر مسلمان کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں دین سے تیرے بھائی بنا دیتا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۳۷)

اس واقعہ سے صرف خرقہ کی برکت و فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور بھی کئی باتیں مستنبط ہوتی ہیں مثلاً:

۱ پیراہن تو رسول اکرم ﷺ کا بھی تھا، لیکن انہیں خود یا خلفائے راشدین کو کفار پر فتح حاصل کرنے کے لئے یہ نسخہ ہاتھ نہ آیا۔

۲ جہاد بالسیف یا اعلائے کلمۃ الحق بس 'ذراسی بات' ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ذراسی بات کے لئے اتنے غزوات کئے۔ وہ بھی بس خرقہ اور دعا سے ہی کام چلا لیتے، تو کیا اچھا ہوتا۔

اب دیکھئے اسی خرقہ کے متعلق بایزید بسطامی کیا کہہ رہے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا: "مجھے برکت کے لئے پوستین کا تھوڑا سا ٹکڑا اعنایت فرمائیے"۔ آپ نے فرمایا: "بھئی! پوستین کا ٹکڑا کیا ہے اگر بایزید کی کھال بھی پاس رکھے گا، تو کچھ نفع نہ ہوگا، جب تک بایزید جیسے کام نہیں کرے گا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۱۷)

۱۱۔ اولیاء اللہ کے جوتوں کے کرشمے

یہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ معین الدین چشتی (م ۶۳۱ھ) ہندوستان میں اسلام پھیلانے کے لئے اجمیر تشریف لائے، تو آپ کا ایک ہندو جوگی سے مقابلہ ہوا۔ ہندو جوگی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ اس نے اپنا جوتا اوپر پھینکا۔ پھر وہ جوتا ہوا میں اڑتا ہوا اوپر چلا گیا۔ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ پھر ہمارے ولی کی باری آئی تو آپ نے بھی اپنا جوتا ہوا میں پھینکا، جو اس جوگی کے جوتے کو مارتے مارتے نیچے اتار لایا۔ حاضرین نے جب یہ دیکھا، تو سمجھ گئے کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے، چنانچہ وہ جوگی، اس کے چیلے آپ کے مرید ہو گئے اور حاضرین

بقیہ صفحہ گذشتہ

دے رہے ہیں۔ (صفحہ ۶۰) پر لکھتے ہیں: "مگر قلعہ کے فتح ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اتنے میں آسمان سے ایک پتھر دیوار پر گرا۔ دیوار ٹوٹ گئی۔ مسلمان اندر گھس گئے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ وہ پتھر سلطان محمود کے پاس لایا گیا۔ اس پر یہ الفاظ لکھے تھے: صاحبہٗ شیخ لقمان سرخسی۔"

میں سے اکثر اسلام لے آئے۔

اس قصہ کا حوالہ مستحضر نہیں اور میں دو وجوہ کی بنا پر اس کے حوالہ کی تلاش کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ ایک تو ایسے واقعات زبان عام و خاص ہیں کہ ہندوستان میں اسلام اولیاء اللہ کے ذریعے پھیلا اور دوسرے اس لئے بھی کہ نیچے درج شدہ واقعات بھی چونکہ کچھ اسی قسم کے ہیں، تو پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؛ ثبوت تو صرف اس بات کا درکار ہے کہ کیا اولیاء اللہ کے جوتے یا کھڑاویں بھی بڑے عظیم کارنامے سرانجام دے سکتی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ ضیاء اللہ قادری "سیرت غوث الثقلین صفحہ ۱۶۷" پر فرماتے ہیں کہ:

دشمن کی سرکوبی

"شیخ ابوعمرو اور ابو محمد عبدالحق سے مروی ہے کہ ہم غوث پاک کی خدمت میں حاضر تھے کہ اس وقت آپ نے اپنی کھڑائیں پہنیں اور وضو فرمایا، اور دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد بلند آواز کرتے ہوئے ایک کھڑاؤں کو ہوا میں زور سے پھینکا۔ پھر اسی طرح دوسری کو بھی پھینک دیا۔ دونوں کھڑائیں ہماری نظر سے غائب ہوگئیں مگر ہم سے کسی کو آپ سے واقعہ معلوم کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تین دن بعد ایک قافلہ آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے غوث اعظم کے حضور نذرانہ پیش کرنا ہے۔ ہم نے اجازت طلب کی، تو آپ نے اجازت دے دی اور کہا کہ جو کچھ نذرانہ دیں، لے لو۔ اس قافلہ نے ہمیں اُونی، ریشمی کپڑے، سونا وغیرہ اور آپ کی وہ دونوں کھڑائیں دیں، جن کو آپ نے ہوا میں پھینکا تھا۔ باہر آکر ہم نے ان سے کھڑاؤں کے متعلق پوچھا کہ کہاں سے ملیں؛ تو انہوں نے بیان کیا کہ تین ۳ صفر کو جا رہے تھے کہ راستہ میں عرب ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور ہمارے قافلہ کے بہت سے افراد کو قتل بھی کر ڈالا۔ اس وقت ہم نے کہا کہ شیخ عبدالقادر ہماری دستگیری فرمائیں اور ہم بچ کر نکل جائیں، تو اپنے مال میں سے آپ کی نذر پیش کریں گے۔ ابھی ہم یہ کہہ ہی رہے تھے کہ دو بلند آوازیں سنائی دیں کہ سارا بیابان گونج اٹھا اور وہ ڈاکو بھی ہیبت زدہ ہوگئے۔ ہم نے سمجھا کہ کوئی شخص آرہا ہے، جو ان ڈاکوؤں سے بھی مال چھین کر لے جائے گا۔ اتنے میں وہ ڈاکو ہمارے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ آؤ تم اپنا مال اٹھالو اور دیکھو! ہمارا کیا حال ہوا ہے۔ ہم وہاں پہنچے، تو ڈاکوؤں کے دونوں سرداروں کو مردہ پایا اور ہر ایک کے پاس پانی سے تر ایک ایک کھڑاؤں پڑی ہے اور انہوں نے ہمارا مال واپس کر دیا۔"

دیکھ لیا آپ نے اولیاء اللہ کی کھڑائیں بھی کتنی کام کی چیز ہیں۔ وقت پڑنے پر پورے ہتھیار کا کام دیتی ہیں۔ کھڑاویں دو تھیں اور ڈاکوؤں کے سردار بھی دو تھے اور ان کھڑاؤں میں یہ شعور بھی تھا کہ ہم نے بس سرداروں

کو ہی ہلاک کرنا ہے، اس کے بعد ہمارا کام ختم ہے۔ البتہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قافلہ والوں نے اپنے بہت سے آدمی مارے جانے کے بعد غوثِ اعظم کو فریاد کے لئے پکارا تھا۔ بروقت پکارتے، تو شاید اُن کے مرے ہوئے لوگوں کی جانیں بھی بچ جاتیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۲۷۲ پر یوں منقول ہے کہ:

"ایک عورت آپ کی مُرید ہوئی۔ اُس پر ایک شخص عاشق تھا۔ ایک دن وہ عورت کسی حاجت کے لئے باہر پہاڑ کی غار کی طرف گئی، تو اس فاسق کو بھی اس کے جانے کا علم ہوگیا، وہ اس کے پیچھے پیچھے ہوگیا اور اس کو پکڑ لیا۔ وہ اس کی عصمت ریزی کرنا چاہتا تھا کہ اس عورت نے بارگاہِ غوثیہ میں فریاد کی اور کہا "الغیاث یا سیدی عبدالقادر!" اس وقت حضرت اپنے مدرسہ میں وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنی کھڑاؤں کو غار کی طرف پھینکا۔ وہ کھڑائیں اُس فاسق کے سر پر لگنی شروع ہوگئیں، حتّٰی کہ وہ مرگیا۔ وہ عورت آپ کی نعلین مبارک لے کر حاضر ہوئی اور مجلس میں سارا قصّہ کہہ سنایا۔ (تفریح الخاطر، ص ۳۷، مطبوعہ مصر)

شمس الدین محمد حنفی کی کھڑاویں

امام اہل سنت احمد رضا خاں بریلوی فرماتے ہیں:

"سیدی محمد شمس الدین محمد حنفی رضی اللہ عنہ اپنے حجرہ خلوت میں وضو فرما رہے تھے، ناگاہ ایک کھڑاؤں ہوا پر پھینکی کہ غائب ہوگئی۔ حالانکہ حجرے میں کوئی راہ اس کے ہوا پر جانے کی نہ تھی۔ دوسری کھڑاؤں اپنے خادم کو عطا فرمائی کہ اسے اپنے پاس رہنے دے جب تک وہ پہلی واپس نہ آئے ایک مدت کے بعد ملک شام سے ایک شخص وہ کھڑاؤں مع ہدایا لے کر حاضر ہوا اور عرض کی کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو جزائے خیر دے جب چور میرے سینے پر مجھے ذبح کرنے بیٹھا میں نے اپنے دل میں کہا: "یا سیدی محمد حنفی" اسی وقت یہ کھڑاؤں غیب سے آکر اس کے سینے پر لگی کہ غش کھا کر الٹا ہوگیا۔ (انوار الانتباہ ص ۱۸ از احمد رضا خاں بحوالہ بریلویت ص ۱۰۹)

کھڑاؤں سے قلب جاری ہونا

رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کا ذکر چل رہا ہے۔

"کوئی صاحب منشی تجمل حسین، جو امداد اللہ مہاجر مکی کی بیعت تھے۔ بڑی آرزو رکھتے تھے کہ کسی طرح ان کا قلب جاری ہوجاتے۔ ادھر ادھر مارے پھرتے تھے۔ تجمل حسین کی بیوی نے بھی حضرت صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ حضرت صاحب نے تجمل حسین سے وجہ پوچھی تو فرمایا، "میاں! اس میں کیا رکھا ہے"، تجمل حسین نے فرمایا: "رکھا تو کچھ نہیں، مگر جی چاہتا ہے۔" آپ نے فرمایا، "اچھا جاؤ مسجد میں جا بیٹھو۔" وہ جا کر مسجد میں جا بیٹھے۔ اِدھر حضرت وضو کر کے کھڑاؤں کو پہن کر

سجد کی طرف چلے، کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سنی کہ اُدھر تجمل حسین صاحب کا قلب جاری ہوگیا۔ دوڑ کر حضرت کے قدم پکڑ لئے کہ میں جو چاہتا تھا، وہ حاصل ہوگیا۔" (تاریخ مشائخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۲۸۵)

مندرجہ بالا واقعات سے بھی چند مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ عموماً لکڑی کی کھڑاویں پہنتے ہیں، کیونکہ وہ مارنے کے لئے بھی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں اور قلب جاری کرنے کے لئے بھی۔

۲۔ پھر اِن کھڑاؤں کا وضو سے بھی گہرا تعلق ہے۔ شاید وضو کا پانی کھڑاؤں کے کارناموں کی تاثیر میں دو آتشہ ثابت ہوتا ہو۔

۱۲۔ لوح محفوظ پر نظر

لوحِ محفوظ کے متعلق قرآن سے تین طرح کی معلومات ملتی ہیں۔ (۱) یہ لوح ہر طرح کی دسترس سے محفوظ ہے (۲) یہ کتابِ مکنون بھی ہے۔ یعنی اس طرح پوشیدہ ہے کہ اسے آس پاس کے مقربین فرشتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ (۳) وہ اُمّ الکتاب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ دُوسرا کوئی اُس کے پاس پہنچ بھی نہیں سکتا۔

لیکن ہمارے اس گروہ صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوحِ محفوظ ہر ولی کی نظر کے سامنے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا رُوم (م ۶۷۲ھ) نے اپنی مثنوی میں، جسے جامی نے فارسی زبان میں قرآن ہی قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

لوحِ محفوظ است پیش اولیاء ازچہ محفوظ است محفوظ از خطا
حال تو دانند یک مُو بہ مُو زانکہ پُرسند از اسرارِ ہُو
بلکہ پیش از دادنِ تو سال ہا دیدہ باشند ت بچندیں سالہا

ترجمہ:۔ (۱) لوحِ محفوظ اولیاء کے سامنے ہوتی ہے وہ کس چیز سے محفوظ ہے؟ وہ خطا سے محفوظ ہے (یعنی اولیاء اللہ سے نہیں) (۲) یہ اولیاء اللہ تیرے ایک ایک لمحہ اور بال کا حال جانتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کے اسرار پوچھ سکتے ہیں۔ (۳) بلکہ یہ

حالی نہوں نے تیری پیدائش سے سالہا سال پہلے اسے لوحِ محفوظ پر دیکھ لیا ہوتا ہے۔

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فرمایا کہ: " اطلاع بر لوحِ محفوظ بمطالعہ و دیدن نقوش نیز از بعضے اولیاء بتواتر منقول است۔" (تفسیر عزیزی، پ ۲۹، سورۂ جن، بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۱۶۶) یعنی اولیاء اللہ کو لوحِ محفوظ کے نقوش کی، دیکھنے اور مطالعہ سے اطلاع ہو جاتی ہے اور بعض اولیاء سے یہ بات تواتر کے ساتھ منقول ہے۔

اب دیکھئے قرآن تو یہ کہے کہ "یہ کتاب مکنون" (پوشیدہ) ہے۔ اب اگر یہ سب اولیاء اللہ کی نظر کے سامنے مان لی جائے، تو پوشیدہ کیسے ہوتی ؛ شاہ عبدالعزیز کی عبارت سے البتہ یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نقل کا تواتر کو صرف "اولیاء اللہ" سے ہے کسی عالمِ دین سے نہیں۔ اور ان اولیاء اللہ کے سلف صالحین، وہی صالحین ہیں جن سے محدثین کسی حدیث کو قبول کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ کیونکہ جھوٹ فوراً بلا عتنیا ان کے منہ سے نکل جاتا ہے،

اب ہم شیخ عبدالقادر جیلانی کے چند واقعات پیش کرتے ہیں۔ ضیاء اللہ قادری 'سیرت غوث الثقلین' کے صفحہ ۱۹۷، پر رقمطراز ہیں کہ:

لوحِ محفوظ میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؛

"ملفوظ الغیاثیہ میں ہے کہ غوثِ اعظم کے زمانہ میں ایک مقرّب کی ولایت سلب کرلی گئی، سب چھوٹے بڑے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے، تو اس نے تین سو ساٹھ اولیاء اللہ سے دعا کی درخواست کی۔ ان سب اولیاء نے اللہ کی بارگاہ میں سفارش کی، لیکن ان سب نے اس کا نام لوحِ محفوظ پر اشقیاء کی فہرست میں لکھا دیکھا اور اسے کہا کہ " اب تم کامیاب نہیں ہوگے۔" اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ بالآخر وہ غوثِ اعظم کے پاس آیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ " اگرچہ تم مردود ہو چکے ہو، تاہم میں تمہیں مقبول بنا سکتا ہوں۔" آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو ندا آئی "کیا تم کو علم نہیں کہ اس کے لئے میرے ۳۶۰ اولیا سفارش کر چکے ہیں اور میں نے ان کی سفارش قبول نہیں فرمائی، کیونکہ یہ لوحِ محفوظ پر شقی اور بدبخت لکھا جا چکا ہے۔" غوثِ پاک نے عرض کیا: "اے ربِ کریم! تو مردود کو مقبول اور مقبول کو مردود بنانے پر قادر ہے۔ اگر تیری منشاء یہی ہے کہ یہ مردود ہی رہے، تو تُو نے اس کو مقبول بنانے کے لئے مجھ سے دعا کیوں کرائی؟" تو ندا آئی: "اے عبدالقادر! اسے میں نے تیرے سپرد کر دیا، جو چاہو بنا دو۔ اور تمہارا مقبول میرا مقبول ہے اور تمہارا مردود میرا مردود ہے۔ بیشک میں نے تم کو معزول کرنے اور مقرر کرنے کے اختیارات عطا فرما دیئے ہیں۔" بعد ازیں آپ نے

اُس کو منہ دُھونے کا ارشاد فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نام اشقیاء کی فہرست سے مٹا کر اصفیاء کی فہرست میں لکھ دیا۔" (تفریح الخاطر، ص ۲۱)

اس اقتباس میں درج ذیل امُور قابلِ ذکر ہیں :

۱۔ دیکھا آپ نے سید عبدالقادر جیلانیؒ نے کتنی زبردست دلیل سے اللہ کو قائل کر لیا ، اور وہ دلیل یہ تھی کہ اگر تم نے اس مسلوبُ الولایت کو مقبول نہیں بنانا تھا، تو پھر مجھ سے دُعا کیوں کرائی تھی ؟ کاش یہ دلیل دوسرے ۳۶۰ اولیاء کو بھی سُوجھ جاتی، تو اس مسلوبُ الولایت کو اتنا زیادہ پریشان اور رُوسیاہ نہ ہونا پڑتا۔

۲۔ اگر عزل ونصب کے جملہ حقوق واختیارات اللہ تعالیٰ نے پیرانِ پیر کو تفویض کر رکھے ہیں، تو مالک الملک اللہ تعالیٰ ہوا یا شیخ عبدالقادرؒ ؟ اور پھر پہلے سے لوحِ محفوظ لکھ رکھنا بھی کچھ سُودمند معلوم نہیں ہوتا۔

۳۔ اس مسلُوب الولایت ولی کی رُوسیاہی چہرہ دھونے سے ہی اُتر گئی۔ شاید دریں اثنا اُس نے نہ کوئی نماز پڑھی نہ ہی وضو کیا تھا۔ ورنہ یہ رُوسیاہی پہلے ہی دُھل چکی ہوتی۔

آخر اللہ تعالےٰ نے ہار مان لی۔

ضیاء اللہ قادری سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۱۹۸ پر فرماتے ہیں کہ :

"منتخب جواہر القلائد میں ہے کہ ایک دن ایک عورت غوث پاک کے پاس آئی اور عرض کی دُعا فرمائیں اللہ کریم مجھے اولاد عطا فرمائے۔ آپ نے لوحِ محفوظ کا مشاہدہ فرمایا، وہاں اس عورت کی اولاد نہیں لکھی ہوئی تھی، تاہم آپ نے اللہ سے دو بیٹوں کی التجا کی۔ تو ندا آئی کہ "لوحِ محفوظ میں تو ایک بھی بیٹا نہیں لکھا ہوا اور آپ دو بیٹوں کا سوال کرتے ہیں ؟" آپ نے تین بیٹوں کے لئے عرض کیا، تو یہی جواب ملا۔ آپ نے چار بیٹوں کا سوال کیا، پھر وہی جواب ملا۔ پھر پانچ کا سوال کیا، تو وہی جواب ملا۔ پھر چھ کا سوال کیا، تو وہی جواب ملا۔ آپ نے سات بیٹوں کا سوال کیا، تو ندا آئی : "اے غوث اتنا ہی کافی ہے۔" اور یہ بشارت بھی ملی کہ " اللہ تعالیٰ اس عورت کو سات لڑکے عطا فرمائے گا۔" (تفریح الخاطر، ص ۴۲، مطبوعہ مصر)

اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بالآخر اللہ تعالےٰ نے ہی سید عبدالقادر جیلانی کے سوالوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ تاہم یہ وضاحت نہیں کی کہ اللہ نے لوحِ محفوظ میں بھی ترمیم کی تھی یا وہ ویسے کی ویسے ہی رہی۔ غالباً کر ہی لی ہو گی۔

لوحِ محفوظ میں تبدیلی کی نئی شکل

ضیاء اللہ قادری سیرت غوث الثقلین کے صفحہ ۲۰۹ پر رقمطراز ہیں کہ :

"السعُود حریمی بیان کرتے ہیں کہ ایک تاجر ابو المظفر نے شیخ حماد کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں سات سو دینار کا مال لے کر ملک شام کی طرف تجارت کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ شیخ حماد نے فرمایا: "اگر تم اس سال سفر کرو گے، تو تم قتل کیئے جاؤ گے اور تمہارا مال لُوٹ لیا جائے گا۔" ابو المظفر مغموم حالت میں باہر نکلا، تو سیدنا غوثِ اعظم سے ملاقات ہو گئی۔ اُس نے شیخ حماد کا ارشاد سنایا، تو آپ نے فرمایا: "اگر تم سفر کرنا چاہتے ہو تو جاؤ، تم سفر سے صحیح و تندرست واپس آؤ گے اور میں اس کا ضامن ہوں۔" یہ بشارت سن کر وہ سفر پر شام کو چلا گیا اور اپنا مال ہزار دینار میں فروخت کیا، پھر وہ حلب گیا اور وہاں اُس نے اپنے دینار ایک مقام پر رکھ دیئے اور وہاں ہی دیناروں کو بھول گیا اور حلب میں اپنی قیام گاہ پر آگیا۔ نیند کا غلبہ تھا، آتے ہی سو گیا، خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ عرب بدوؤں نے اُس کا قافلہ لُوٹ لیا ہے اور قافلے کے کافی آدمیوں کو قتل بھی کر دیا ہے اور وہ خود بھی قتل ہو گیا ہے۔ گھبرا کر بیدار ہوا، تو اسے اپنے دینار یاد آئے، اس مقام پر پہنچا، تو دینار اسے ویسے ہی پڑے ہوئے مل گئے اور وہ واپس بغداد آگیا اور آکر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پہلے شیخ حماد کو ملوں یا شیخ عبدالقادر کو کہ حسن اتفاق سے شیخ حماد سے ملاقات ہو گئی، تو شیخ حماد نے فرمایا: "پہلے غوث پاک کی حاضری دو۔ وہ محبوبِ سبحانی ہیں، انہوں نے ستر مرتبہ تمہارے حق میں دُعا مانگی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کریم نے اس بیداری کا واقعہ خواب میں تبدیل کر دیا۔" چنانچہ ابو المظفر شیخ عبدالقادر کی خدمت میں آیا، تو آپ نے فرمایا کہ: "جو کچھ تمہیں شیخ حماد نے سلطان بازار میں کہا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے تیرے لئے اللہ کریم سے ستر مرتبہ دُعا کی تھی کہ تیرے قتل کے واقعہ کو خواب میں بدل دے اور تمہارے مال کے ضائع ہونے کو تھوڑی دیر کے لئے نسیان سے بدل دے۔" (قلائد الجواہر ص ۶۵، تحفہ قادریہ، ص ۴۱، ۴۲)

یہ قصہ بھی بہت خوب ہے، مگر اس میں دو باتیں ضرور کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جب پہلی بار ابو المظفر شیخ حماد کا جواب سن کر باہر نکلا، تو اسی وقت اس کی شیخ عبدالقادر سے ملاقات ہو گئی۔ جنہوں نے اسی وقت جان و مال کی ضمانت دے دی، تو اُن کو ستر مرتبہ دُعا کا موقع ہی کب ملا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس بات کا یقین ہو کہ میں ستر مرتبہ دعا بعد میں کر لوں گا اور اللہ تعالیٰ کو اس تبدیلی کے لئے منوا کے چھوڑوں گا۔ لہٰذا ابو المظفر کو ضمانت دے دی ہو۔

اور دوسری یہ بات کہ جب وہ خواب میں قتل ہوا، تو اگر اس وقت اس کے ہزار دینار اس کے پاس ہی ہوتے، تو بھی اُن کے ضائع ہونے کا چنداں خطرہ نہ تھا۔ قصہ گھڑنے والے نے خواہ مخواہ ابوالمظفر سے حلب کے ایک مقام پر پیسے رکھوائے، جو وہ بیداری کے بعد لینے گیا تھا اور مفت میں حلب کا چکر ڈلوا دیا۔

البتہ اس لحاظ سے ہم اس قصہ نزاش کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس نے شیخ حماد اور شیخ عبدالقادر دونوں کی لاج رکھ لی۔ رہی لوحِ محفوظ کی تحریر کی بات تو یہ اللہ کا کام ہے، جیسے چاہے بعد میں ترمیم کرتا ہے۔

اس عقیدہ کی مزید توثیق

شیخ عبدالقادر جیلانی کا بیان ہے کہ "مجھے اپنے ربِّ جلیل کی عزت وعظمت کی قسم! میرے سامنے نیک بخت اور بدبخت لوگ پیش کئے جاتے ہیں۔ میری نظر لوحِ محفوظ پر ہوتی ہے۔ میں اللہ کے علوم اور مشاہدات کے سمندروں میں تیرنے والا ہوں۔" (سیرت غوث، ص ۱۳۶، بحوالہ بہجۃ الاسرار، ص ۲۲۔ قلائد الجواہر، ص ۲۶۔ تفریح الخاطر، ص ۴۶)

اور صوفیاء کے شیخ اکبر ابنِ عربی نے تو اپنی کتاب فصوص الحکم پوری کی پوری لوحِ محفوظ کو دیکھ کر نقل فرمائی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:

"میں نے اسے لوحِ محفوظ سے نقل کیا۔ بعد میں ۶۲۷ھ کے محرم میں رسول اللہ ﷺ کو دمشق کے شہر محروسہ میں دیکھا۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ آپ نے فرمایا: "یہ کتاب فصوص الحکم ہے۔ اس کو محفوظ کرو اور لوگوں کے سامنے پیش کرو، تاکہ انہیں فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق اسے لوگوں میں پھیلانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس میں کمی بیشی کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔" (فصوص، ص ۴۷، ۴۸)

اس تین سطر کے اقتباس میں ابنِ عربی کے فصوص الحکم کے متعلق دو بیان ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے یہ کتاب لوحِ محفوظ سے نقل کی دوسرے یہ کہ کچھ ہی عرصہ بعد یہی کتاب محروسہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے خود ان کو بھی لکھائی دی تھی۔ دونوں بیان ایک دوسرے سے بڑھیا ہیں۔ ان میں سے جونسا چاہیں قبول فرما لیجئے۔ یا چاہیں، تو دونوں ہی قبول فرمائیے۔

پھر تو یہ دستور ہی چل نکلا کہ جس شخص کے جی میں آئے کہدے کہ میں نے اپنی کتاب لوحِ محفوظ سے نقل کی ہے۔ چنانچہ فرغانی صاحب نے بھی مرشد کامل کی تصنیف کے متعلق بھی ایسا ہی دعوٰے کر دیا جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔

۱۳۔ عبادات میں غلو اور بدعات

بدعت کی اقسام

بدعات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ عبادات و نوافل جن کا ثبوت کتاب و سنت میں موجود ہے، اس پر کچھ اضافہ کر لیا جائے۔ مثلاً:

رسول اکرم ﷺ رات کو عبادت بھی کرتے تھے اور سوتے بھی تھے۔ اب اگر ایک شخص خالص نیکی کے جذبہ سے تہیہ کر لے کہ میں ساری رات قیام کر کے اللہ کی عبادت میں مشغول رہوں گا، تو یہ غلو فی العبادت اور ایک طرح سے بدعت ہے۔ اسی طرح نمازِ تہجد رسول اکرم ﷺ پر فرض تھی، دوسروں پر نہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنے آپ پر قیام اللیل کو فرض قرار دیتا ہے، تو اس کی بھی یہی صورت ہوگی اور اگر کوئی شخص پانچ فرض نمازوں کے بجائے چھ نمازیں اپنے آپ پر فرض کر لیتا ہے، تو یہ بھی بدعت ہے۔

اسی طرح روزہ کی مثال ہے۔ حضور اکرم ﷺ بعض دفعہ خود تو متواتر روزے رکھتے چلے جاتے تھے۔ افطاری نہیں فرماتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے دوسروں کو اس سے منع فرما دیا۔ نیز آپ ﷺ نے امت کو ہمیشہ روزہ رکھنے سے منع فرما دیا۔ اب اگر کوئی شخص روزانہ روزے رکھتا چلا جاتے، تو یہ عبادت بھی مقبول نہیں بلکہ مذموم ہوگی، جیسا کہ ہم اس سے بیشتر کئی احادیثِ صحیحہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

صدقہ و خیرات کی بھی مثال اسی طرح ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس جو کچھ ہوتا دے دلا کر فارغ ہو جاتے لیکن اُمت کو یہ اُصول بتایا کہ اَلصَّدَقَةُ عَنْ ظَهْرِ غِنًى (بخاری) یعنی صدقہ وہ ہے جس کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے، تو اگر کوئی مسلمان آپ ﷺ کے اس فرمان کا لحاظ نہیں کرتا، تو یہ فعل مسنون نہیں، بلکہ بدعت ہوگا۔

یہی حال حج کا ہے۔ حج اس شخص پر فرض کیا گیا ہے جس کے پاس راستہ کی سواری کا اور اپنے کھانے پینے کا خرچ بھی ہو اور گھر والوں کے پاس بھی خرچ چھوڑ جائے۔ اب اگر کوئی شخص حج پیدل چل کر دور دراز کا سفر طے کرنے کی نیت کرتا ہے۔ یا راستے میں لوگوں سے مانگ کر کھاتا ہے یا لوگوں سے رقم فراہم کر کے حج کرنے جاتا ہے یا سواری پاس موجود ہو تو از راہِ تبرک اس پر سوار نہیں ہوتا، تو یہ سب کام نیکی کے کام نہیں، بلکہ خلافِ شرع ہیں اور بدعت ہیں۔

یہ تو عبادات میں اضافہ کی بات تھی۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اضافہ تو نہیں کرتا۔ البتہ اس کے طریقِ کار میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہے اور بزعمِ خود یہ سمجھتا ہے کہ یہ طریقہ مسنون طریق سے بہتر اور افضل ہے اس کی مثال درج ذیل واقعہ سے واضح ہوتی ہے:۔

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ لوگ مختلف حلقوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر حلقہ کے درمیان کنکریوں کا ڈھیر ہے اور ہر حلقہ میں ایک آدمی کھڑا ہے، جوان سے کہتا ہے کہ سو بار "سبحان اللہ" کہو۔ لوگ سبحان اللہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار "الحمد للہ" کہو۔ لوگ الحمد للہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار "اللہ اکبر" کہو۔ تو لوگ اللہ اکبر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر کہا: "اللہ کی قسم! کیا تم ایسے دین پر ہو، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہدایت والا ہے یا تم گمراہی کے دروازے کھول رہے ہو۔ (دارمی ص۶۸)

اب دیکھئے سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کا وظیفہ کرنا مسنون ہے، لیکن اپنے طور پر، اُس کی جو شکل ان لوگوں نے اختیار کی وہ دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں تھی۔ لہٰذا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے گمراہی قرار دیا۔ کیونکہ ذکر اذکار یہ طریق مسنون نہیں بدعیہ تھا۔

بدعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کا اصل بھی آثار و سنت میں موجود نہ ہو اور وہ دین کا کام اور ثواب سمجھ کر رائج کی جائے۔ اور ایسی بدعات بے شمار ہیں۔ مثلاً عید کی نماز سے پہلے اذان دینا۔ اذان سے پہلے درود کہہ کر اذان کا شروع کرنا، یہ تیجا، ساتواں کے ختم شریف وغیرہ۔ صوفیاء میں ترکِ دنیا اور نفس کی ریاضتیں اور چلہ کشی، حبسِ دم وغیرہ سب اسی ذیل آتے ہیں۔

ہر طرح کی بدعت گمراہی ہے

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بدعت جب بھی شروع کی جاتی ہے، تو نیک ارادوں، نیک تمناؤں، خدا کی خوشنودی اور ثواب کی نیت سے شروع کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود سراسر گمراہی ہے، جیسا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ اور جو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی تقسیم کر کے بدعتِ حسنہ کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی اس حدیث کی رُو سے سراسر گمراہی ہی ہوتی ہے۔

بدعتِ حسنہ کے جواز میں جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جماعت تراویح شروع کرائی اور پھر

دیکھ کر فرمایا کہ "نِعمِ البِدعَۃ ھٰذِہٖ" تو اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر بدعت کا لفظ شرعی اصطلاح کے طور پر نہیں، بلکہ لغوی مفہوم کے طور پر استعمال فرمایا تھا۔ نمازِ تراویح کی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کئی بار کرائی۔ یہاں اس سے مراد صرف نیا پن (NOVELTY) (قاموس الجدید العصری) ہے۔ یعنی جماعت کا التزام جو آپ نے فرمایا۔ جب لوگ پہلے سے اکیلے اکیلے مختلف ٹولیوں کی صورت میں با جماعت ادا کر رہے تھے۔

بدعت کا دوسرا پہلو

کسی سنت میں کمی کرنا عصیان ہے۔ جیسے کوئی شخص صلوٰۃ موقتہ میں فرضوں کے علاوہ کبھی سنتیں نہ پڑھے، تو یہ عصیان ہے اور یہ قابلِ معافی ہے مگر سنت میں اضافہ کرنا یا نئی بات شامل کرنا غلو فی العبادات اور بدعت ہے جو کفر اور شرک کی حدوں کو چھوتا ہے، لہٰذا یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ الّا یہ کہ توبہ کر لی جائے۔ کیونکہ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ طریق کو ناکافی اور شریعت کو نامکمل سمجھ کر اس میں اضافہ کیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ بندے کا شرک کے سوا تمام گناہوں میں مبتلا ہو جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ کسی بدعت میں مبتلا ہو، لیکن جب ہم ان صوفیاء کے اعمال و کردار پر نظر ڈالتے ہیں، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبادات و افعال میں سے بیشتر بدعات ہی کا مجموعہ ہیں۔ اب ہم ان کی کتابوں سے مستند واقعات پیش کریں گے جو اس دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں:

اویسؒ قرنی کی عبادت

"کیمیائے سعادت، تفسیر حسینی، تذکرۃ اولیاء، مجالس المؤمنین اور روضۃ الصالحین مذکور ہے کہ جناب خواجہ اویس قرنی بعض رات کو آپ فرماتے: "ھٰذِہٖ لَیْلَۃُ الرُّکُوْعِ" ساری رات رکوع کی حالت میں رہنے صبح ہوتی، تو رکوع سے سجدہ میں جاتے۔ بعض رات کو آپ فرماتے "ھٰذِہٖ لَیْلَۃُ السُّجُوْدِ" (یہ شب سجدہ کی شب ہے) اور ایک ہی سجدے میں صبح ہو جاتی۔ کسی نے عرض کیا یا اویس! یہ آپ کو کس طرح اطاعت کی طاقت ہے کہ ایک رکوع یا ایک سجدے میں رات بسر کر دیتے ہیں؟ آپ نے آہ بھرتے ہوئے فرمایا: "کاش! ازل سے ابد تک ایک ہی رات ہوتی کہ ایک رکوع یا ایک سجدے میں رات تمام کر دیتا۔"

"ایک اور روایت ہے کہ حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ میں کبھی بھی اچھی طرح ایک بار بھی سبحان ربی الاعلیٰ کہنے نہیں پاتا کہ سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ اور تین بار تسبیح کہنا تو سنت ہے، میں تو سنت بھی پوری کرنے نہیں

پاتا۔ پھر فرمایا: "میں یہ سب کچھ اس لئے چاہتا ہوں کہ فرشتوں کی طرح عبادت کروں۔" (الاولیں، ص ۳۷)

یہ ہے اتباع سنت کا نمونہ، جو مندرجہ بالا پانچ کتابوں میں مذکور ہے۔

عبداللہ خفیفؒ کی عبادت

"رات دن عبادت میں مصروف رہتے۔ کہتے ہیں کہ ایک ایک رکعت میں ہزار بار قل شریف پڑھتے تھے۔ غذا بہت کم ہوتی تھی۔ روزہ صرف سات دانہ منقہ سے افطار فرماتے اور بس۔ اسی وجہ سے عبداللہ خفیف مشہور ہوئے۔" (مقربانِ حق۔ خلاصہ تذکرہ اولیاء، ص ۱۵۹)

یہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ایک ہزار قل شریف پڑھنے میں کتنا وقت صرف ہو سکتا ہے اور وہ ہر رکعت میں اتنی بار جو پڑھتے تھے، تو فرض نمازوں کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔

امام جعفر صادقؒ کا صدقہ

"امام صاحب کا ایک دوست حج پر روانہ ہوا اور رخصت ہوتے وقت اس نے دس ہزار درہم آپ کو بطورِ امانت دیئے اور کہا کہ اس سے میرے لئے میری واپسی تک مکان خرید رکھیں۔ آپ نے اس کے جانے کے بعد وہ سارا روپیہ اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیا جب وہ واپس آیا، تو آپ نے فرمایا: "تمہارے لئے میں نے جنت میں مکان خرید لیا ہے۔ جس کی ایک دیوار رسول اللہ ﷺ کے مکان کی دیوار سے ملتی ہے، دوسری دیوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان سے، تیسری حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور چوتھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے گھر سے ملتی ہے اور

لے **دوسرا پہلو**: اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ اگر اس گروہ میں افراط اور تفریط کی انتہا پائی جاتی ہے۔ عبدالکریم جیلی مصنف انسان کامل لکھتے ہیں کہ ابلیس اپنی ذریت کو انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جب بھیجتا ہے، تو ہر گروہ کو الگ الگ کام کے لئے تاکید کرتا ہے۔ اس ضمن میں شیطانوں کا ایک گروہ "اہل علم کو تعلیم دیتے ہیں کہ وہ مناجات و عبادات کی پستی میں قائم رہیں۔" مصنف کی یہ بات اس کے مترجم کو بھی ناگوار محسوس ہوئی، تو اس نے ساتھ ہی یہ صراحت کر دی کہ:

"مناجات اور عبادات سعادت میں داخل ہیں، لیکن عارفین موحدین، جو توحید وجودی پر فریفتہ ہیں۔ اس کو حجابات میں داخل کرتے ہیں۔ اسی لئے شیطانی ضلالت میں مصنف علیہ الرحمۃ نے اسے داخل کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔" (انسان کامل، ص ۳۹۱)

ہم حیران ہیں کہ جب مترجم نے مصنف کے اس فعل کو غلط اور توحید وجودی پر فریفتگی پر محمول کیا ہے تو اس مصنف کو عارفین موحدین کے زمرہ میں شامل کرنے کے کیا معنی ہیں اور انہیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ سے یاد کرنے کیا معنی ہیں؟ کیا اس طرح وہ زمرہ عارفین موحدین کی توہین تو نہیں کر رہے ہے؟ کیا ایسے لوگوں کو عارفِ موحد کہنا درست ہے؟

میں نے اس کی دستاویز بھی تیار کر لی ہے، جو تمہارے حوالہ کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایک کاغذ لائے، جو اس کے حوالے کر دیا۔ اس شخص نے یہ کاغذ اپنے پاس رکھا اور وفات سے پہلے وصیت کی کہ یہ دستاویز میرے کفن میں رکھی جائے۔ اس کے لواحقین نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن لوگوں نے وہ کاغذ اس کی قبر پر پڑا پایا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا کہ "جعفر بن محمد کی تحریر کو منظور کر لیا گیا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۹)

اس روایت کے راوی نے کئی غلط باتیں امام جعفرؒ کی طرف منسوب کر دیں، مثلاً:

۱۔ امانت کی رقم یا تو مالک کو واپس دینا ضروری ہے۔ یا اسے مالک کی مرضی کے تحت خرچ کرنا، اس کے علاوہ دوسرے کسی مصرف میں خواہ اس سے ہزار گنا بہتر ہو، بیں وہ رقم خرچ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن امام صاحب نے کسی کی رقم کو اپنی طرف سے صدقہ کر کے شریعت کی خلاف ورزی کی۔

۲۔ پھر جو جنت میں مکان لے کر دیا اس کا کوئی بیرونی دروازہ ہے ہی نہیں، جو سڑک یا گلی کی طرف کھلتا ہو۔ جس سے وہ خود یا اس کے اقارب داخل ہو سکیں۔

۳۔ اس بیچارے کو اس دنیا میں رہائش کے لئے مکان کی ضرورت تھی۔ رقم جنت کے مکان پر لگ گئی، تو بیچارا مرنے تک کرایہ کے مکان میں گزارا کرتا رہا ہوگا۔

۴۔ جنت میں رسول اللہ ﷺ کا مقام وسیلہ ہے۔ جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں اور یہی دعا ہر مسلمان اذان کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حق میں مانگتا ہے۔ پھر آپ کے مکان کی دیوار کے ساتھ اس شخص کی یا دوسروں کی دیواریں کیسے ہو سکتی ہیں۔

۵۔ دنیا میں تو اسے مکان نہ مل سکا اور جو جنت کے مکان کی دستاویز کی توثیق ہوئی، تو وہ بھی مرنے کے بعد اور بغیر دستخطوں کے جو اسے نہیں بلکہ دوسروں کو ملی۔ وہ بھی سوچتا تو ہوگا کہ امام موصوف پر ایسا اعتماد کیوں کیا؟

ابوالحسن خرقانی (م ۴۲۵) کا صدقہ اور قرض بذمہ میت

"فرمایا: دنیا سے قرضدار جانا اور قیامت کے دن قرض خواہوں کا دامن گیر ہونا پسند ہے۔ مگر سائل کی حاجت کو رد کر دینا گوارا نہیں۔"

(صوفیائے نقشبند، ص ۱۴۰)

ایک دفعہ کسی صحابی نے آکر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں!" وہ سائل مڑ کر چلا، تو آپ نے اسے واپس بلایا اور فرمایا کہ "ابھی ابھی جبریل

آیا، تو اُس نے فرمایا ہے "اِلَّا الدَّیْنَ" [1] یعنی شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر قرضہ معاف نہیں ہوتا۔ آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ جس میت کے سر پر قرض ہو جب تک کوئی شخص اس قرضہ کی ادائیگی کی ضمانت نہ دے دیتا۔ آپ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے اور صحابہ سے فرماتے تھے کہ جاؤ تم خود ہی اس کا جنازہ پڑھ لو۔ بایں ہمہ ابوالحسنؒ خرقانی کو یہ سب کچھ گوارا ہے۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ سائل خالی ہاتھ واپس جائے۔ جس کے لئے شریعت نے مکلف نہیں کیا۔

معروفؒ کرخی کا تبسّم

"وفات کے وقت شیخ سری سقطیؒ حاضرِ خدمت تھے کہا مجھے نصیحت و وصیت فرماتے۔ فرمایا: "میں مروں، تو میرا کُرتہ صدقے میں دے دینا تاکہ دنیا سے برہنہ جاؤں، کیونکہ بطن مادر سے برہنہ ہی پیدا ہوا تھا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۹)

دیکھا آپ نے، اِسے کہتے ہیں اتباعِ سنّت۔ کیا میت کو کپڑوں میں کفنانا سنت نہیں؟

ابوالحسین کے اُستاد کی غیرتِ فقر

"امام ابوبکر اسحاق کلا بازی لکھتے ہیں:

"شیخ ابوالحسین درّاج نے سرمہ دانی کی تلاش میں اپنے استاد کے برتن کو ٹٹولا، تو اس میں چاندی کا ایک ٹکڑا پایا۔ فرماتے ہیں، اس پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب استاد آئے، تو میں نے عرض کیا؛ آپکے برتن میں مجھے چاندی کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔ انہوں نے فرمایا: تم نے دیکھ لیا ہے؟ اُسے وہیں رکھ دو۔ پھر کہا اسے تم لے لو۔ اس پر میں نے کہا: آپ کو اپنے معبود کی قسم! اس ٹکڑے کا کیا قصہ ہے؟ فرمایا: "اللہ نے اس کے سوا کوئی اور سونے یا چاندی کا ٹکڑا نہیں دیا۔ تو میں نے چاہا میں وصیت کروں کہ اسے میرے کفن کے ساتھ باندھ دیا جائے، تاکہ اسے اللہ کو واپس کر دوں۔" یہ رہی ان کی غیرتِ فقر۔" (روحِ تصوف، ص ۱۷۰، بحوالہ التعرف، ترجمہ پیر محمد حسن صاحب)

اب دیکھئے کیا 'عطائے تو بلقائے تو' کی اس سے زیادہ واضح کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟ اور کیا یہ استاد صاحب اس طرح اللہ تعالےٰ کے سب انعامات کا حساب چکا سکتے ہیں؟ اگر اتنی ہی غیرتِ فقر تنگ کر گئی تھی، تو جب اللہ نے یہ ٹکڑا دیا تھا، اس وقت لیا ہی کیوں تھا؟ کیا یہی خدا کے انعامات کے شکریہ کے انداز ہیں۔ ؎

خداوندا تیرے یہ سادہ دِل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری و سلطانی بھی عیاری

---

[1] مسلم۔ کتاب الامارۃ باب اعتذ اللہ للمجاہد۔۔۔)

اب اس فقر کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے:

پیرانِ پیرؒ (م ۵۶۱ھ) کا قیمتی لباس اور اس کی وجہ جواز

"بغداد کے مشہور بزاز ابوالفضل راوی ہیں کہ غوث پاک کا خادم میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھے ایسا قیمتی اور عمدہ کپڑا درکار ہے جس کی قیمت فی گز ایک اشرفی ہو۔ نہ قیمت اس سے کم ہو نہ زیادہ۔" میں نے پوچھا: "اتنا قیمتی کپڑا کس کے واسطے درکار ہے۔ خادم نے حضورؒ کا نام لیا۔ میرے دِل میں خیال آیا کہ جب ایسا قیمتی لباس فقرا پہنیں گے، تو خلیفہ وقت کیا پہنے گا؟ انہوں نے تو بادشاہ کے لئے تو کوئی کپڑا ہی باقی نہ چھوڑا۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ میرے پاؤں میں غیب سے ایک ایسی کیل چبھی کہ قریب المرگ ہوگیا۔ ہر چند نکالنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ آخر آنحضرت کے پاس لائے۔ آپ نے فرمایا: "اے ابوالفضل! تو نے اپنے دل میں ہم پر کیوں اعتراض کیا؟ خدا کی قسم! میں نے اس کپڑے کو نہیں پہنا جب تک مجھے یہ نہ کہا گیا کہ ایک قمیص ایسے کپڑے کا پہن، جس کی قیمت فی گز ایک اشرفی ہو۔" (اخبار الاخیار فارسی، ص ۲۱، تفریح الخاطر، ص ۲۳۔ قلائد الجواہر، ص ۴۵۔ نزہتہ الخاطر الفاتر، ص ۴۰۔ تحفہ قادریہ، ص ۵۱۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۴۶)

دیکھا قیمتی لباس کے جواز کے لئے کیا خوب صورت افسانہ تراشا گیا ہے۔ ادھر ابوالفضل کے دل میں خیال آیا، اُدھر غیب سے ایک ایسی کیل چبھی کہ نکالنے سے نکلتی ہی نہ تھی اور جان لیوا ثابت ہوئی۔ پھر اُس کا علاج بھی کسی حکیم، ڈاکٹر کے بجائے صرف پیرانِ پیر کے پاس تھا۔ شاید ابوالفضل کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میری اصل مرض یہ کیل چبھنا نہیں، بلکہ پیرانِ پیر کے متعلق دل میں یہ خیال آنا تھا اور اس جرم میں مجھے غیب سے سزا ملی ہے۔ پھر اس لاعلاج مریض کو جب آپ کے پاس لایا گیا، تو آپ نے اس کے اصل مرض یا جرم ہی کا علاج فرمایا اور کیل تو امید ہے خود بخود ہی نکل گئی ہوگی اور زخم بھی اسی دم مندمل ہوگیا ہوگا۔ تاہم اس بات کا تذکرہ ان پانچ سات تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔

اب اسی طرح کا ایک دوسرا قصہ ملاحظہ فرمائیے:

شیخ ابوالسعودؒ کی قیمتی پگڑی

"شیخ ابوالسعود (م ۵۷۹ھ) پیرانِ پیر کے بزرگ ترین خلفا سے تھے۔ مکلف طعام کھاتے اور لباس فاخرہ پہنتے۔ ایک دفعہ دو سو دینار قیمت کی دستار پہن رکھی تھی۔ ایک درویش کے دِل میں خیال آیا کہ یہ تو فضول خرچی اور قرآن کے حکم کے خلاف ہے اس سے تو دو سو درویشوں کا لباس تیار ہوسکتا ہے۔ شیخ کو

نورِ باطن سے یہ بات معلوم ہو گئی۔ آپ نے درویش کو کہا یہ پگڑی بازار میں لے جا کر بیچ ڈال اور درویشوں کے لئے طعام مہیا کر۔ اس درویش نے پگڑی بیچ کر مکلّف دسترخوان آراستہ کیا مگر شیخ کو دیکھا تو وہی پگڑی سر پر تھی۔ بڑا حیران ہوا۔ شیخ نے فرمایا: "حیران نہ ہو اور اس شخص سے اس کی کیفیت پوچھ"۔ چنانچہ اس شخص نے کہا "میں پچھلے سال کشتی میں سوار تھا کہ طوفان نے آگھیرا۔ میں نے منت مانی، اگر بچ گیا، تو ایک قیمتی دستار شیخ کی نذر گزرانوں گا۔ چھ ماہ سے مجھے کوئی قیمتی دستار مل نہیں رہی تھی۔ آج ایک دکان پر دیکھی، تو خرید کر ہدیہ شیخ کیا۔ شیخ نے کہا: "سنا! میں نے یہ پگڑی خود نہیں باندھی، بلکہ کسی اور نے بندھوائی ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۷۶)

سچ فرمایئے کہ الف لیلہ کی داستانیں اچھی ہیں یا اولیاء اللہ کی کرامات کے یہ قصے؛ بہرحال لباسِ فاخرانہ کا جواز تو مل گیا کہ وہ ندائے غیب یا حکمِ الٰہی کی بنا پر پہنا کرتے ہیں۔ البتہ فقر یہ حضرات اپنی طرف سے اختیار فرماتے ہیں۔

کم خوری کا معیار

"بزرگوں کا قول ہے کہ سالک کی بھوک اختیاری ہے، کیونکہ اگر وہ سیر ہو کر کھائے گا، تو اس کا نفس زور پکڑے گا اور پھر سالک اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ نفس کو اتنا ضعیف اور ناتواں کرنا چاہئے کہ اگر اسے بال میں جکڑ دیں، تو اسے نہ توڑ سکے یہ بات بھوک کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔" (مرشدِ کامل، ص ۹۵)

یہی وہ ریاضت ہے جس کی وجہ سے حضورِ اکرم ﷺ مسلسل روزہ رکھنے سے منع فرمایا اور فرمایا "حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے اور دشمن کے مقابلے میں جنگ سے بھاگتے نہ تھے۔" اور فرمایا "وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ۔"

ترکِ دنیا کا معیار

"نقل ہے کہ بایزید بسطامی کو ۷۰ دفعہ خدا کا تقرب حاصل ہوا۔ آپ نے ہر دفعہ کہا میں ابھی پورا کلمہ گو اور مسلمان نہیں ہوا کئی سالوں تک آپ نے ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانا جبہ رکھا آخر چالیس رات دن ریاضت کرتے رہنے کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ الٰہی! اگر تو مجھے اپنے فضل و کرم سے باریابی کا شرف عطا فرمائے، تو تیرا کیا نقصان ہے؟" ہاتف نے آواز دی۔ "بایزید! تو اس ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانے جبے سے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔" آپ نے اسی وقت دونوں کو زمین پر پھینک دیا اور آپ کا مقصد حاصل ہو گیا۔" (مرشدِ کامل، ص ۹۶)

اس واقعہ کی ابتدا میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ بایزید کو ۲، دفعہ خدا کا تقرب حاصل ہوا۔ پھر اور کون سے شرفِ باریابی کی التجا فرما رہے تھے۔ کیا خدا کے تقرّب حاصل ہونے اور خدا کا شرفِ باریابی میں کچھ فرق ہے؟ یہی ایک نکتہ باقی ہے کہ آپ کو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ یہ جبہ اور لاٹھی مسلمان ہونے کی شان کے منافی ہے جس کی تائید ہاتفِ غیبی نے کر دی۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں رسولِ خدا ﷺ بھی استعمال فرماتے تھے، تو ایسی ندائے غیبی کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

بایزید بُسطامیؒ کا نماز دہرانا

"حضرت بایزید بُسطامی نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی بعد از فراغت امام نے پوچھا: "یا حضرت! آپ مانگتے بھی کسی سے کچھ نہیں اور کرتے بھی کچھ نہیں، تو گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟" آپ نے فرمایا: "ٹھہرو! میں نماز کا اعادہ کر لوں، کیونکہ جو اپنے رازق کو نہیں پہچانتا اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔" (ردِ تصوف، ص ۱۶۳، بحوالہ تاریخ مشائخ نقشبندیہ، ص ۵۲)

دیکھا آپ نے اس سوال پر بُسطامیؒ نے کتنی گرمی کھائی اور کیسا مسکت جواب دیا۔ امید ہے اس امام نے زندگی بھر پھر کبھی ایسا سوال نہ کیا ہوگا۔ رہا نماز کا مسئلہ، تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پہلی نماز جو امام کے پیچھے پڑھی تھی، ہو گئی تھی۔ اگر پھر بھی آپ نے غصہ میں اعادہ فرما لیا ہو تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

عبدالقادر جیلانیؒ کا وضو

"ابوالفتح ہروی بیان کرتے ہیں کہ میں غوثِ اعظم کی خدمت میں چالیس سال تک رہا اور اس مدت میں میں نے آپ کو ہمیشہ عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۵۹۔ قلائد الجواہر، ص ۷۶۔ اخبار الاخیار، ص ۱۰۔ جامع کرامات، ج ۲، ص ۲۰۱۔ نفحات الانس، ص ۔ طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۸۔ محفل نامہ گیارھویں شریف، ۲۴۹۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۸۴)

اب دیکھئے ہروی صاحب کے اس بیان کو ۸ تذکرہ نگاروں نے نقل فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت نہایت ہی معتبر ہے۔ مگر یہی ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرتِ غوث" کے صفحہ ۲۴ پر فرماتے ہیں کہ "آپ کی اولاد کثرت تعداد میں تھی۔ اس اولاد میں سے صرف دس لڑکوں کے نام لکھے ہیں۔ اور یہ ان لڑکوں کے نام ہیں جو زیادہ مشہور ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی کل اولاد بیس چالیس سے کم کیا ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چالیس سال میں، جن میں آپ نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی

کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ یا کسی بیوی کے پاس نہ گئے تھے؛ کیا اتنی کثیر تعداد میں اولاد والا شخص مسلسل چالیس سال تک اس فطری عمل سے رُک سکتا ہے۔ اسی ایک بات سے ان تذکرہ نگاروں کی روایتوں کی صحت کا بھرم کُھل جاتا ہے۔ پھر قادری صاحب بھی بلا سوچے سمجھے حوالہ جات کا انبار لگائے چلے جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس کا اِمکان بھی ہے یا نہیں؛

پیرانِ پیرؒ کے نوافل

"آپ ہر روز ایک ہزار رکعت نفل ادا فرماتے تھے۔"

(تفریح الخاطر، ص ۲۶، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۸۵)

اب دیکھئے فطری حوائج، کھانا، پینا، سونا سب آپ کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ پانچ فرض نمازیں جن پر تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ کی مجالس وعظ بھی منعقد کیا کرتے اور درس دیا کرتے تھے۔ پھر آپ کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے آپ کے خانگی مسائل بھی بہت تھے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اگر فل سپیڈ پر حنفیوں والی نماز بھی ادا کی جائے، تو بھی اوسطاً ایک منٹ فی رکعت کے حساب سے ایک ہزار رکعت پر ۱۶ گھنٹے ۴۰ منٹ صرف ہوتے ہیں اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں باقی صرف ۷ گھنٹے اور ۲۰ منٹ بچتے ہیں، ان میں مندرجہ بالا حوائج پورے ہو سکتے ہیں؛

شیخ محمد میر کی عبادت و ریاضت

"ان کی ریاضت کا یہ حال تھا کہ رات کبھی نہ سوتے اور حبسِ دم کی یہ حالت تھی کہ ایک دم میں تمام رات گزر جاتی اور ایک ہفتہ کے بعد روزہ افطار ہوتا تھا اور کبھی بحالتِ جذب و استغراق ایک ایک ماہ تک طعام کھانے کی نوبت نہ پہنچتی تھی۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہم نے چار باتیں نشان زد کر دی ہیں جو سُنّتِ نبوی کے خلاف ہیں۔ پھر یہ شریعت کی اتباع ہوئی یا جوگیانہ طریقِ ریاضت؛

شیخ شاہ محمد مشہور بہ مُلّا شاہ قادری اور اتباعِ سُنّت

"اپنے گھر میں کبھی کھانا نہ پکاتے اور نہ رات کو چراغ جلاتے، سوائے ایک بوری کے کبھی فرش کے محتاج نہ ہوتے۔ ذکر اُن کا ہمیشہ حبسِ دم کے ساتھ ہوتا۔ تمام عمر میں کبھی آنکھیں اُن کی نیند سے آشنا نہ ہوئیں اور نہ نکاح کیا۔ اور ہمیشہ یہ ان کی عادت میں داخل تھا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تمام عمر میں ہم کو غسلِ جنابت اور احتلام کی حاجت نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں غسل

نکاح اور نیپند سے متعلق ہیں اور ہم نے نہ تو نکاح کیا ہے اور نہ سوئے ہیں..... ان کا دیوان فارسی ان کی عمدہ تصانیف سے ہے اور ہر ایک شعر میں مضامین "وحدتِ وجودی" مترشح ہیں۔" (حدیقۃ الاولیا ص ۵۷)

غرض ان کے ایسے واقعات کہاں تک پیش کئے جائیں۔ کوئی بزرگ روزانہ صرف ایک چنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کوئی ایسے ہیں کہ روزہ کی افطاری کے لئے جو روٹی ان کو دی جاتی۔ جب ایک ماہ بعد گئے، تو ان کے حجرہ میں پوری تیس روٹیاں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ وغیرہ ذٰلک۔ کیا ایسے افعال و عبادات کا سنت سے کوئی تعلق ہے؟

۱۴- اکلِ حلال میں غلو کی حد تک احتیاط

اکلِ حلال کی اہمیت

اسلام میں اکلِ حلال کو بہت اہمیت حاصل ہے حرام کھانے والے کی نہ نماز قبول ہوتی ہے، نہ صدقہ اور نہ دُعا۔ پھر مسلمانوں کو اس بات کی بھی تنبیہہ کی گئی ہے کہ مشتبہہ مال سے بھی پرہیز کیا جائے، کیونکہ جو انسان مشتبہہ مال کو مباح سمجھنے لگے گا، تو پھر کسی وقت حرام مال کو مباح سمجھنے کے لئے گنجائشیں نکالنے لگے گا۔ لیکن اس احتیاط کی بھی ایک حد مقرر ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو بلاتحقیق و تجسس یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مال حرام ہے یا مشتبہ؟ اور اس کی مثالیں دورِ صحابہ، تابعین و تبع تابعین میں بکثرت ملتی ہیں۔

احتیاط کی حدود

کسی مال کے متعلق تحقیق و تجسس سے معلوم کرنا کہ آیا یہ حلال ہے یا نہیں؟ ہم اس کے مکلف نہیں کہ ہم اس کی تحقیق و تجسس بھی کرتے پھریں۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب السوال باسماء اللہ، میں درج ذیل حدیث مذکور ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ هُنَا اَقْوَامًا حَدِیْثًا عَهْدُهُمْ بِشِرْكٍ یَاْتُوْنَا بِلُحْمَانٍ لَا نَدْرِیْ	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہاں چند ایسے آدمی ہیں (جو نومسلم ہیں) ابھی اُن کا شرک کا زمانہ تازہ

يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللهِ عَلَيْهَا اَمْ لَا ؛ قَالَ : "اُذْكُرُوْا اَنْتُمْ اِسْمَ اللهِ وَكُلُوْا ۔" (بخاری، کتاب التوحید)

گزرا ہے۔ وہ ہمارے پاس کٹا ہوا گوشت (بیچنے کو) لاتے ہیں۔ ہم کو معلوم نہیں کہ انہوں نے اللہ کا نام لیا یا نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا "تم اللہ کا نام لے کر اسے کھا لیا کرو۔

حضورِ اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان سے تحقیق کر لیا کرو۔ اشتباہ کے بجائے اباحت کے پہلو کو ملحوظ رکھا۔ مزید تسلی کے لئے خود اللہ کا نام لینے کا حکم دیا۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے ایک دو واقعات بھی ملاحظہ فرمالیجئے :

۱۔ ایک دفعہ سفر میں آپ ایک تالاب کے قریب اُترے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ : "یہاں درندے تو پانی نہیں پیتے" ؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو روک دیا کہ : "نہ بتانا" اس سے دو اُصول ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اصل اشیاء اباحت ہے۔ دوسرے یہ کہ ظاہر حالت اگر صحیح ہے، تو تفحص اور جستجو پر ہم مکلّف نہیں ہیں۔ (الفاروق، شبلی، ص ۳۵، مطبوعہ سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور)

۲۔ ایک دفعہ رمضان میں بدلی کی وجہ سے آفتاب کے چھُپ جانے کا دھوکہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روزہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب نکل آیا۔ لوگ متردّد ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

اَلْخَطْبُ يَسِيْرٌ وَقَدِ اجْتَهَدْنَا

یعنی معاملہ چنداں اہم نہیں۔ ہم اپنی طرف سے کوشش کر چکے تھے۔ (مؤطا امام محمد، ص ۱۸۴، بحوالہ ایضاً)

گویا مشتبہ مال سے بچنے کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ کسی چیز میں کرید کر کے اس کا پورا اتا پتہ لے کر اس سے اطمینان کر لیا جائے۔ بلکہ اس کا یہ معنیٰ ہے کہ ایک معیّن حرام چیز سے ملتی جلتی چیز سے بھی پرہیز کیا جائے۔ اگرچہ اس کے احکام واضح نہ ہوں۔ مثلاً سُود حرام ہے، تو اس سے ملتی جلتی چیز مثلاً کمرشل انٹرسٹ بھی حرام سمجھا جائے گا۔ یا اگر سود اور قمار دونوں حرام ہیں، تو بیمہ بھی حرام قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں ان دونوں چیزوں کا عنصر موجود ہے۔ یا اگر عورتوں کو موسیقی کی تعلیم دلانا حرام ہے، تو مردوں کے لیے بھی موسیقی یا سماع جائز نہیں قرار پا سکتا، وغیرہ۔

حِلّت وحُرمت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی حرام کی کمائی اگر جائز طریقے سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے، تو دوسرے آدمی کے لئے حلال ہوگی۔ فقہی زبان میں اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "ہاتھ کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں۔" اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک آدمی سُودی کاروبار کرتا ہے

اب کوئی دوسرا آدمی اس کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کر کے اس کی قیمت اس سے وصول کرتا ہے، تو دوسرے آدمی کو خواہ یہ بات معلوم ہو کہ یہ شخص سودی کاروبار کرتا ہے، تب بھی وہ رقم اُس دوسرے آدمی کے لئے حلال متصور ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ دین کے اصول لوگوں کو مشکلات میں ڈالنے کے لئے نہیں ہیں۔

اب اِن احکامات وارشادات کی روشنی میں ہم صوفیاء کے چند واقعات درج کریں گے اور دیکھیں گے کہ اگر یہ واقعات صحیح ہیں، تو انہیں اس مشکل میں پڑنے کا کوئی جواز ہے بھی یا نہیں؛ اور اگر نہیں، تو کیا وہ اس ذیل میں نہیں آتے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۔ (۶۶/۱) اے نبی ﷺ! تم اپنے پر وہ چیزیں کیوں حرام کرتے ہو، جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں۔

صوفیاء کی احتیاط

حضرت سفیان ثوریؒ

حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق تذکرہ نگار رقمطراز ہیں کہ:

"جب کوئی آپ کی دعوت کرتا، تو رَدّ نہ کرتے، کیونکہ حدیث میں ہے، 'جو دعوت دے اُسے قبول کرو'، لیکن روٹی اپنے گھر سے لے جاتے اور وہی کھاتے۔ صاحب خانہ کی دریافت پر فرماتے، تجھے اپنی روٹی کا حال معلوم ہے، مگر مجھے معلوم نہیں کہ حلال مال سے ہے یا حرام سے۔ مجھے اپنی روٹی کا علم ہے کہ حلال سے ہے۔ تیرے بلانے سے میں آگیا، لیکن روٹی اپنی کھاؤں گا۔"

(مقربانِ حق، ص ۶۵)

غور فرمائیے دعوت قبول کرنے اور عمل بالحدیث کا یہی مطلب ہے۔ پھر جب محض شُبہ کی بنا پر صاحبِ خانہ یا میزبان کو یہ جواب ملے، تو اس کی کس قدر دِل شکنی ہوتی ہوگی۔ جب صوفیاء کا یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے۔

دِل بدست آور کہ حج اکبر است

حضور اکرم ﷺ کا تو یہ اسوہ تھا کہ ایک دفعہ کسی دعوت پر سارے کا سارا سالن ختم کر دیا کہ اس میں نمک زیادہ تھا اور آپ کو یہ خیال آیا کہ کہیں سالن کی اس بدمزگی پر میزبان کی دِل شکنی نہ ہو۔ لیکن حضرت سفیان ثوری کا یہ عمل دبشرطِ صحت؛ میزبان کو کس قدر بَددل کر دیتا ہوگا۔

حارث محاسبی

"نقل ہے کہ ایک روز آپ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔ آپ بھوکے تھے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا، "ایک شادی کے گھر سے کھانا آیا ہوا ہے، چاہیں تو لا دوں۔" پھر کھانا لائے۔ آپ نے لقمہ منہ میں ڈالا، لیکن حلق سے نہ اُترا۔ آخر اُگل دیا۔ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر مشتبہ کھانے میں ہاتھ ڈالتے، تو انگلیاں ٹیڑھی ہو جاتیں۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۲)

اب دیکھئے رسول اکرم ﷺ نے یہودیہ عورت کی (زہر آلود) بکری کا گوشت کھایا اور آپ کے صحابہؓ نے بھی۔ پھر آپ کو زہر کا احساس بھی اس وقت ہوا جب لقمہ منہ میں ڈال لیا۔ آپ ﷺ کی مرض الموت میں اس زہر کو بھی دخل تھا۔ لیکن محاسبیؒ کی مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے انگلیاں ہی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ (۲) اس مشتبہ کھانے کا حضرت جنیدؒ جیسے بلند پایہ ولی اللہ کو تو علم تک نہ ہو سکا لیکن وہ حارث محاسبی کے گلے سے اُترتا ہی نہیں فیا للعجب!

احمد بن حربؒ

"نقل ہے کہ ایک بار آپ کی والدہ شریفہ نے ایک مرغ ذبح کیا اور کہا: "یہ مُرغ میرے گھر کا پالا ہوا ہے۔ اس میں کچھ شک وشبہ نہیں۔ اسے کھاؤ۔" آپ نے کہا: "یہ وہی مُرغ تو ہے، جو ایک روز ہمسائے کے کوٹھے پر چلا گیا اور وہاں سے دانے کھا آیا تھا۔ یہ میرے لئے حلال نہیں۔" (ایضاً، ص ۲۱۴)

غور فرمائیے! اگر حلال وحرام کا یہی معیار قائم کیا جائے، تو دنیا میں کوئی چیز حلال ثابت کی جا سکتی ہے؟ اس معیار کے مطابق تو آپ نے جو کچھ زندگی بھر کھایا تھا، اس میں بھی شُبہ کے بیسیوں پہلو نکل آتے ہیں۔

بلا تبصرہ

"نقل ہے کہ آپ کا ایک بیٹا رِند مشرب تھا۔ بزرگوں نے اس کی شکایت کی، فرمایا: "اصل یہ ہے کہ ایک روز پڑوسی کے گھر سے کھانا آیا تھا، میں نے کھا لیا۔ اسی رات خلوت کا اتفاق ہوا جس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ وہ کھانا پڑوسی کو بادشاہ کے گھر سے ملا تھا۔ یہ اُسی کا اثر ہے۔ آپ دُعا فرمائیے۔ اللہ میری خطا معاف فرمائے۔" (ایضاً، ص ۳۱۴)

امام ابن قیم رحمہ اللہ کا فتویٰ

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ ایسے 'محتاط' صوفیاء پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یا اتنا صُوفی و پرہیز گار بنا پھرے کہ عام مسلمانوں کا کھانا طعام ہی ترک کر دے کہ مبادا اس کے اندر حرام و مشتبہ مال چلا جائے اور بعض علم سے کورے اور جاہل صوفیاء و زہاد پر تو اس بیہودہ ورع و پرہیز گاری کا جنون اس قدر سوار ہوا کہ اسلامی شہروں کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز تک کو حرام و مشتبہ سمجھ کر ٹال دیتے اور نہ کھاتے مگر عیسائی

شہروں سے آئی ہوئی چیزوں کو حلال و طیب جان کر ڈکار جاتے۔ تو دیکھئے ان جاہل صوفیوں کو جہل مفرط اور غالیانہ زُہد نے ہی اہلِ اسلام سے بدظن کر دیا اور عیسائیوں کے حق میں حسن ظنی اور خوش فہمی کا بیج بو دیا۔ (نعوذ باللہ)" (ذکرِ الٰہی، ص ۷۰۳۔ ترجمہ، وابل الصیب از ابنِ قیم)

۱۵۔ پہیلیوں کی زبان اور اسرار و رموز

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے عوام الناس کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ لہٰذا یہ ٹھیٹھ اور واضح عربی میں نازل کیا گیا۔ یہ کوئی پہیلیوں، معموں اور رموز و نکات کی کتاب نہیں اور تبلیغ کے لئے یہی سب سے بڑی خوبی ہونی چاہیئے کہ وہ آسان اور عام فہم زبان میں ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مطالب کو مختلف انداز اور مثالوں سے سمجھایا، تاکہ کوئی اُلجھن نہ رہے۔ رسول اکرم ﷺ کا بھی یہی طریقِ تبلیغ تھا، لیکن یہ صوفیاء عام فہم انداز سے ہٹ کر رموز و نکات کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ واقعات

حسن بصری کا واعظ

"نقل ہے کہ حضرت حسن بصری جب وعظ کے لئے منبر پر کھڑے ہوتے، تو دیکھتے آیا رابعہ (بصریہ) موجود ہیں یا نہیں؛ اگر موجود ہوتیں، تو وعظ کہتے ورنہ منبر سے اُتر آتے۔ جب تک رابعہ مجلس میں نہ آتیں آپ وعظ نہ کہتے۔ ایک بار لوگوں نے کہا: "کیا وجہ ہے کہ جب تک ایک ضعیفہ نہ آئے آپ وعظ نہیں کہتے حالانکہ لوگ بکثرت موجود ہوتے ہیں۔" فرمایا: "ہاتھیوں کی غذا چیونٹیوں کے آگے نہیں رکھی جا سکتی۔ سبحان اللہ" (مقربانِ حق، ص ۴۶)

اب سوال یہ ہے کہ آپ تبلیغ لاتعداد چیونٹیوں کے لئے فرماتے تھے یا صرف ایک ہاتھی کے لئے؟ اگر ہاتھی کے لئے آپ وعظ کی غذا مہیا کرتے تھے، تو چیونٹیوں کو تکلیف دینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ ہاتھی کو وہ غذا تو علیحدہ ہی دینا چاہیئے جو چیونٹیوں کے کام کی نہیں۔ پھر یہ سوال چیونٹی اور ہاتھی کا نہیں بلکہ چیونٹے اور ہتھنی کا ہے۔ اگر

رابعہ بصری، حسن بصری سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو یہ ویسے خلاف شرع ہے اور اگر کرتی تھیں، تو پھر حسن بصری کو یہ کیونکر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب تک تشریف لائی ہیں یا نہیں؟

اور اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ آیا حسن بصریؒ اور رابعہ بصری کی ملاقات بھی ثابت ہے یا نہیں۔ حضرت حسن بصری کا سن وفات بالاتفاق '۱۱۰ھ' ہے اور رابعہ بصری کا سن پیدائش بقول بعضے '۹۹ھ' اور بقول بعضے '۹۵ھ' ہے۔ رابعہ بصری کو بچپن ہی میں کسی نے پکڑ کر فروخت کر دیا تھا۔ ان کی پاک طینت نے خریدار کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے رابعہ بصریہ کو رہا کر دیا۔ (دائرۃ المعارف، ج ۱۰، ص ۹۲) ان حالات میں یہ واقع ہی سرے سے تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں رابعہ بصریہ کے بوڑھا ہونے کا ذکر ہے اور یہ ۱۱۰ھ تک محال ہے۔

رابعہ بصریہ اور گورے کالے کا فلسفہ

"نقل ہے کہ ایک بار آپ نے کسی کو چار سو درہم دیئے تا کہ کمبل لا دے۔ اس نے پوچھا: "کالا کمبل لاؤں یا سفید؟" آپ نے سنا اور درہم واپس لے کر دجلہ میں ڈال دیئے۔ فرمایا "اسباب دنیا سراسر فساد ہے، کمبل ابھی خریدا نہیں کہ کالے اور سفید کا تفرقہ شروع ہو گیا۔" اللہ اللہ!" (مقربانِ حق، ص ۴۸)

دیکھا آپ نے، جو حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا کہ "سفید کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔" تو یہ مسئلہ کس خوبی سے حل کیا جا رہا ہے۔ آپ نے چار سو درہم تو دریا برد کر دیئے تاہم یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل فرما دیا۔

احمد خضرویہ کی مہمان نوازی

"نقل ہے کہ حضرت احمد خضرویہ کے پاس ایک درویش بطورِ مہمان آئے۔ ان کے ساتھ ستر اور درویش تھے۔ آپ نے ان کی خاطر ستر شمعیں روشن کیں۔ اُنہوں نے کہا یہ کیا اسراف ہے؟ آپ نے فرمایا: "میں نے آپ کی عزت رضائے الٰہی کے لیئے کی۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ مہمان فرستادۂ خدا ہوتا ہے اس کی عزت بڑھ کر کرنی چاہئے۔ آپ اُٹھیئے اور جس شمع کو میں نے خدا کے لئے روشن نہ کیا ہو اُسے بجھا دیجئے۔ انہوں نے شمعوں کو بجھانا اور اُن پر خاک ڈالنا شروع کیا مگر نہ بجھا سکے۔ صبح ہوئی تو بہت متعجب تھے۔ آپ نے اُن سے کہا آئیے! تمہیں ایک اور عجیب چیز دکھائیں۔ درویش یہ سُن کر ساتھ ہو لیا۔ آپ اس کو لے کر باہر تشریف لائے۔ جب ایک کلیسا کے پاس پہنچے، تو دروازہ پر ایک راہب کو بیٹھے پایا۔ اُس نے آپ کو دیکھا اور کہا: "اندر تشریف لائیے۔" پھر دستر خوان بچھا کر عمدہ کھانے رکھے اور کہا "تناول فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا: "دوست، دشمن کے ساتھ نہیں کھایا کرتے۔" اس نے کہا: "تو مجھے بھی دوست بنا لیجئے۔ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور اس کے گھر کے ستر آدمی اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ آپ نے اس درویش سے فرمایا: "میں نے خدا کے لئے ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ خدا نے مجھے یہ شرف بخشا کہ اس نے میرے ہاتھ ستر گمراہوں کے دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔" (مقربانِ حق، ص)

اس واقعہ سے مندرجہ ذیل نکات حل ہوتے ہیں:

۱۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد 'مہمان کی تکریم' سے مراد اس کے لئے الگ شمع جلاتا ہے۔ خدا کی رضا اور کی خوشنودی کا یہی طریقہ ہے۔

۲۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسی شمع کسی کے بجھاتے بجھ نہیں سکتی، خواہ اُن پر مٹی بھی ڈالی جائے۔

۳۔ ایسی شمعیں جلانے سے مزید اسرارِ غیبی کھلتے ہیں اور یہ شمعیں کسی کافر کے ظلمت کدہ کو جا کر منور کرتی ہیں۔

۴۔ مہمانوں اور شمعوں کے ساتھ پرتکلف کھانوں کا تعلق بھی ہوتا تو ہے، لیکن وہ کسی اور جگہ ہوتا ہے۔

۵۔ راہب تو تارکِ دنیا ہوتے ہیں۔ پھر یہ راہب بیٹھا بھی کلیسا کے دروازے پر تھا اس کے گھر کے ستر آدمی کہاں سے آ گئے؟ اگر اس کے گھر ستر آدمی واقعۃً تھے اور وہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی رکھتا تھا، تو وہ یقیناً راہب نہیں تھا۔

۶۔ امید ہے کہ اس راہب کے مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اور آپ کے ساتھی درویش نے اس کا پکا ہوا کھانا تو کھا ہی لیا ہوگا۔

اب دیکھئے بالکل ایسا ہی واقعہ شبلی اور ابو حفص کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہاں بھی چالیس مہمانوں کے لئے چالیس شمعیں تو جلیں جو بجھ نہ سکیں اور پرتکلف کھانوں کا تعلق بھی تھا مگر اِن شمعوں کے کسی ظلمت کدۂ دل کو منور کرنے کا وہاں ذکر نہیں۔ (مقربانِ حق، ص ۱۵۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد خضرویہ شبلی سے بہت بلند درجہ کے ولی تھے۔

سری سقطیؒ (م ۲۵۰ھ) کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام

"ایک روز آپ نے خواب میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا، کہا: "اے جدِ پیغمبراں! دنیا میں گرفتارِ عشقِ یوسف ہو کر یہ کیا شور و فغاں پیدا کر دیا۔ عشقِ یوسف کے ساتھ عشقِ حق کس طرح جمع ہو سکتا ہے؟" غیب سے ندا آئی "سری!

خاموش رہ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے جمالِ جہاں آرا، کو دیکھ۔" جونہی جمالِ یوسفؑ کو دیکھا، غش کھا کر گر پڑے۔ تیسرے روز ہوش میں آئے۔ پھر ندائے غیبی آئی: "سری! یہ اس شخص کی سزا ہے جو عاشقانِ خدا کو ملامت کرتا ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۲)

اس روایت کو بار بار پڑھئے اور بتلائیے کہ:

۱ حضرت یعقوب علیہ السلام عاشقِ یوسف تھے یا عاشقِ حق؟ دونوں باتیں تو بہر حال جمع نہیں ہو سکتیں جو سریؒ سقطی کا اصل اعتراض تھا۔

۲ دو بار ندائے غیبی آئی۔ پہلی ندائے غیبی کے ساتھ سری سقطی کو حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال جہاں آرا کا دیدار بھی کرا دیا گیا۔ پھر بھی سری سقطی کو تین دن بے ہوش کر کے اور زبردستی سزا دے کر چپ کرایا گیا حالانکہ سری صاحب کا اعتراض پھر بھی جُوں کا تُوں قائم رہا۔

شبلی کا زُہد

"شبلی سے زہد کے متعلق سوال کیا گیا، تو فرمایا: "درحقیقت زُہد کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ یا تو انسان اس چیز سے زُہد اختیار کرے گا جو اس کی ملکیت ہی نہیں یا اس چیز سے زُہد اختیار کرے گا، جو اس کے لئے ہے۔ لہٰذا انسان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس نے زُہد کیا۔ حالانکہ وہ چیز (یعنی دنیا) اس کے ساتھ اور اس کے پاس ہر وقت موجود رہتی ہے۔ لہٰذا یہ نفسِ انسانی کی ڈینگ، سخاوت اور غمخواری کے سوا کچھ نہیں ہے۔" (تعرف، ص ۱۴۳)

فرمائیے! کچھ سمجھے آپ کہ زُہد کیا ہے؟ اگر زُہد نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہیں، تو قرونِ اولیٰ کے صالحین جنہیں زہاد کہا جاتا تھا، وہ کیا تھے؟

غرض ان صوفیاء نے معاملات اور اخلاقیات میں کچھ اس طرح سے افراط و تفریط یا غلو سے کام لیا کہ ؎

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

والی بات بن جاتی ہے۔

ب۔ اخلاقِ حسنہ کی تعریفیں

اب ہم صُوفیا کی مشہور اور مستند کتاب "التعرف" سے اخلاقیات سے متعلق کچھ اقوال پیش کریں گے۔ جن کی صورت بعینہٖ وہی ہے، جو ہم نے بیان کی ہے:

صبر: کسی ایک صُوفی نے کہا ہے: "اس نے صبر میں صبر کے ساتھ مقابلہ کیا یہاں تک کہ صبر پکار

اٹھا۔ فریاد۔ اور صابر نے پکار کر کہا اے صبر! صبر کرو۔" (تعرف، ص ۱۴۴)

شکر : ایک بڑے صوفی کا قول ہے : "انعام کنندہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شکر کو بھول جانا شکر ہے۔" (تعرف، ص ۱۵۴)

تقویٰ : سہل تستری فرماتے ہیں : "اللہ کی طرف مائل ہونے کی مقدار کے مطابق احوال کا مشاہدہ کرنا تقویٰ ہے۔" (تعرف ۱۵۱)

۲ : سہل تستری فرماتے ہیں : "تقوائے سے مراد اوروں سے بیزاری ہے اور یہی اخلاص ہے۔" (تعرف، ص ۱۵۱)

توکّل : سری سقطی فرماتے ہیں : "توکّل یہ ہے کہ تو اپنی معصیت سے رُکنے کی قدرت اور نیک کام کرنے کی طاقت سے علیحدگی اختیار کرے۔" (تعرف، ص ۱۵۵)

۲ : بقول کسی بڑے صوفی کے اس کا مفہوم یہ ہے : "توکّل کی حقیقت ترکِ توکّل ہے اور یہ اس طرح ہے کہ اللہ ان کے لئے ایسا ہو جیسا اس وقت تھا۔ جب وہ موجود نہ تھے۔" (تعرف، ص ۱۵۶)

اخلاص : ابو یعقوب سوسی فرماتے ہیں : "خالص عمل وہ ہے جس کا فرشتے تک کو پتہ نہ ہو کہ لکھ سکے اور نہ شیطان کو خبر ہو کہ اسے خراب کر سکے اور نہ نفس کو پتہ ہو کہ اس پر فخر کر سکے۔" (تعرف ۱۵۳)

رضا : سفیان ثوری نے رابعہ کی موجودگی میں کہا : "خدایا! تو مجھ سے راضی ہو جا۔" اس پر رابعہ نے اسے کہا : "کیا تجھے اس خدا سے رضامندی طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، جس سے تو راضی نہیں ہے۔" (تعرف ۱۵۷)

یقین : نوری فرماتے ہیں : "یقین مشاہدہ کا نام ہے۔" اور سہل فرماتے ہیں : "یقین پردے کے کھل جانے کا نام ہے۔" (تعرف ۱۵۹)

ذکر : جنید فرماتے ہیں : "جس نے اللہ کے مشاہدہ کے بغیر اللہ کہا وہ مُفتری ہے۔ ایک اور کہتا ہے : "دل کا کام مشاہدہ کرنا ہے اور زبان کا کام اس مشاہدہ کو بیان کرنا ہے۔ لہٰذا جس نے مشاہدہ کے بغیر بیان کیا وہ جھوٹا ہے۔" (تعرف ۱۶۲)

قرب : کسی نے کہا ہے : "قُرب یہ ہے کہ تو اس کے ان افعال کا مشاہدہ کرے، جو تمہارے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔" (تعرف، ص ۱۶۷)

تصوف اور کسب حلال : "میں نے ابوالحسین محمد بن احمد فارسی کو کہتے سنا ہے کہ" تصوف کے دس ارکان ہیں۔ پہلا رکن تجرید توحید ہے۔ پھر سماع کا سمجھنا، حسن معاشرت، ایثار الایثار، ترکِ اختیار، سرعتِ وجد، دلوں کی باتوں کا ظاہر کرنا، روزی نہ کمانا اور نہ ذخیرہ کرنا۔ (تعرف ۱۴۵)

ج۔ ایمان اور ارکانِ اسلام کے اسرار و رموز

اب اسرار و رموز کی تیسری قسم ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور متصوف عبدالکریم جیلی صاحب ارکان اسلام کے رموز اور باطنی معنے سمجھا رہے ہیں :

اسرار کلمۂ شہادت : جاننا چاہئیے کہ کلمۂ شہادت بھی دو امروں پر مبنی ہے۔ ایک 'سلب' اور وہ 'لا' ہے۔ دوسرے 'ایجاب' اور وہ 'الا' ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اور لفظ 'الٰہ' سے مراد یہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ اور یہ بہ سبب ان کے اس سرِ وجود کے جو ان کی ذوات میں ہے۔ اُن کی موافقت ہے۔ پس وہ بوجود خود سچے معبود ہیں.... اس لئے کہ اللہ تعالےٰ عین اس کا ہے اور وہ اللہ جس طور بھی ظاہر ہوا، الوہیت کا مستحق ہے۔ پھر اس نے اپنے قول الا اللہ میں ان سب کو ایک بنا دیا ہے۔ یعنی یہ معبود سوائے ایک اللہ کے کچھ نہیں ہیں۔ یا یوں کہو کہ یہ معبود غیر اللہ نہیں ہیں۔ پس نہ عبادت کرو تم مگر بطورِ اطلاق ایک اللہ کی۔ نہ کسی جہت کی قید لگا کر اس لئے کہ ذاتِ حق ہی تمام جہتیں ہیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔" (انسان کامل، ص ۴۲۵)

اسرار طہارت اور نماز : نماز سے مراد حق تعالیٰ کی واحدیت ہے اور اس کی اقامت سے تمام اسماء و صفات سے متصف ہو کر ناموسِ وحدیت کی اقامت کی طرف اشارہ ہے اور طہارت سے مراد نقائص کونیہ سے پاک ہونا ہے اور اس میں پانی کی شرط، اس بات کی طرف اشارہ کہ نقائص کونیہ زائل نہیں ہوتے۔ مگر آثارِ صفاتِ الٰہیہ کے ظہور سے کہ وجود کی زندگی میں اور پانی میں بھی زندگی کا راز رکھا گیا ہے اور ضرورت پر تیمم کا طہارت کے قائم مقام ہونا مخالفات، مجاہدات، ریاضات کے ذریعہ نفس کو پاک کرنے کی طرف اشارہ ہے۔" (ص ۴۳۶) پھر اسی طرح مصنف صاحب نے نماز کے تمام ارکان و افعال مثلاً تکبیر تحریمہ، سورۂ فاتحہ کی قرأت، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ، التحیات وغیرہ سب کو اسرار و رموز کی زبان میں

بیان فرمایا ہے۔

اسرارِ زکوٰۃ : اور زکوٰۃ یہ ہے کہ بعد تزکیہ کے حق کو خلق پر ترجیح دے یعنی وجود میں شہودِ حق کو شہودِ خلق پر ترجیح دے .... باقی رہا نقدی کا اس میں چالیسواں حصہ ہونا۔ سو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود کے چالیس مرتبہ ہیں اور مطلوب مرتبہ الہٰیہ ہے اور وہ مرتبہ علیا ہے اور چالیس میں سے ایک ہے۔" (انسانِ کامل، ص ۴۳۷)

اسرارِ صوم : روزہ بشری خواہشات (یعنی کھانا، پینا، سونا، جنسی اور معاشرتی تعلقات) کے رواں کرنے سے نفس کو بسو کنے کا نام ہے۔ تاکہ وہ صفاتِ حمدیہ الہٰیہ سے متصف ہو۔ علی قدرِ امتناعِ نفس، آثارِ حق نفس میں ظاہر ہوتے ہیں اور روزوں کا ایک ماہ کامل تک ہونا اس بات کی ضرورت کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی بھر تک نفس کو خواہشاتِ نفسانی سے روک رکھنا چاہیئے۔ یہ خیال نہ کرے کہ میں اب واصل بحق ہو گیا ہوں۔ مقتضیاتِ بشری کے چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔" (انسانِ کامل ۴۳۷)

رموزِ حج : حج سے اشارہ طلبِ الٰہی میں مدام کمر بستہ رہنے کی طرف ہے اور احرام سے اشارہ شہودِ مخلوق کا ترک کر دینا ہے اور سلے ہوئے کپڑے کے ترک کرنے سے اشارہ ریاستِ بشریہ کے ترک کرنے کی طرف ہے اور ناخن کٹوانے کے ترک سے اشارہ ان فعلوں میں، جو اس سے صادر ہوں، خدا کے فعل کا مشاہدہ کرنا ہے۔" ..... پھر نماز کی طرح حج کے بھی تمام ارکان و افعال مثلاً خوشبو کا ترک کرنا، نکاح کا ترک کرنا، شریہ کو ترک کرنا کے اشارے بتلائے ہیں۔ بعد میں مرادیں بتلانا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً میقاتِ قلب سے مراد ہے مکہ مرتبہ الہٰیہ سے مراد ہے۔ پھر کعبہ، حجرِ اسود، طواف، طواف کے بعد نوافل، سعی، سر منڈانا وغیرہ سب کی یا مرادیں بتلا دی ہیں یا اشارے بیان فرما دیئے ہیں۔" (ص ۴۳۸، ۴۳۹)

رموزِ ایمانی : ایمان عالمِ غیب سے کشف کا پہلا مرتبہ ہے اور وہ سواری ہے، جو سوار کو مقاماتِ علیہ تک پہنچاتی ہے اور مشاہدہ منزہ کی سیر کراتی ہے اور وہ اس چیز کے ساتھ قلب کی موافقت سے مراد ہے جس کا ادراک عقل سے بعید ہے۔ جو چیز عقل سے معلوم کی جاتی ہے اس کے ساتھ دل کی موافقت کا نام ایمان نہیں ہے، بلکہ وہ علمِ نظری ہے جو مشہود دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے پس وہ ایمان میں داخل نہیں ہے۔" (انسانِ کامل ص۴۴)

WWW. DEENEKHALIS.COM

باب (۶)

آستانے اور مزارات

توحید کیا ہے؟

وحی الٰہی ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق، مالک، رازق صرف ایک اللہ ہے۔ وہی اکیلا اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اور اسے اس نظامِ کائنات کو چلانے میں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ البتہ انسان اور جن کو کسی حد تک اختیار دیا گیا ہے، کہ وہ چاہے تو خدا کی ہدایت کو تسلیم کر کے دنیوی اور اخروی کامیابی حاصل کرے اور چاہے تو نافرمان رہے۔ اس آسمانی ہدایت کو بدل وجان تسلیم کر لینے کا نام ہی اسلام ہے جس کا آغاز ایک اقرار "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" سے ہوتا ہے۔ یعنی "تمام کائنات میں اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔"

شرک فی العبادات

عبادت، بندگی اور غلامی کو کہتے ہیں۔ تو جس طرح ایک غلام ہر حالت میں اپنے آقا کے لطف و کرم کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ ہر حال میں اسی کے لطف و کرم کا محتاج رہے۔ اس کے احکام کی برضا و رغبت تعمیل کرے۔ تکلیف ہو تو صرف اسے پکارے اور کوئی ضرورت ہو تو صرف اس کے سامنے پیش کرے، اسی سے دُعا کرے، اسی سے مدد طلب کرے، اسی سے فریاد کرے، اسی سے ڈرے اور اسی سے امید رکھے اور یہ بھروسہ بھی رکھے کہ وہ آقا و مالک ہر دُعا، التجا اور فریاد کو ہر وقت سنتا اور اس کی تکلیف کو دور کرنے یا ضرورت پوری کرنے پر قادر ہے الغرض وہ اختیاری امور جن میں انسان سے اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

انابت (رجوع) اطاعت، محبت، خضوع، توکل، دُعا، استعانت، خوف، امید، قربانی، نذر و نیاز اور اس کے گھر (کعبۃ اللہ) کا طواف شعائر اللہ کی تعظیم اور اس کے لطف و کرم پر مکمل اعتماد۔

اب اگر ان مندرجہ بالا امور میں سے کوئی کام یا ساری باتیں اللہ کے سوا کسی دوسرے شخص میں یا مقام معیّن میں تسلیم کرے یا اس کی طرف رجوع کرے گا تو اسی چیز کا نام شرک ہے۔ گویا اس نے خدا کی خدائی یا تصرف و

اختیار میں کسی دوسرے کو بھی شریک سمجھ لیا ہے۔ اور یہ گناہ ناقابلِ معافی ہے خواہ وہ کسی مسلمان سے سرزد ہو یا کافر سے۔

دینِ طریقت کے اثرات

اب دینِ طریقت کے نظریات پر غور فرمائیے :

جس انسان کے بدن میں خدا حلول کر گیا، وہ تو خدا ہی بن گیا۔ اور اس کو ماننے والے اس انسان کے پجاری یا عبادت گزار۔ اب جتنے انسانوں کے وجود میں خدا حلول کر چکا ہے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ سب خدا ہی ہیں۔

اسی طرح کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی انسان خدا کی ذات میں مدغم یا فنافی اللہ ہو جاتا ہے تو وہ بھی ۔ ؎ مردانِ خدا ، خدا نباشند لیکن ز خدا جُدا نباشند

ترجمہ : خدا کے بندے خدا تو نہیں ہوتے ، لیکن خدا سے الگ بھی نہیں ہوتے ،

کے مصداق ان کے فنافی اللہ ہونے کے باوجود ان کے مادی جسم خداؤں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اور ان کے معتقدین ۔ان کے پجاری اور عبادت گزار۔

اور وحدت الوجود کے نظریہ نے ہر چیز کو خدا کا حصہ قرار دے دیا۔ آپ بھی خدا ہیں اور میں بھی خدا ، اب عبادت تم میری کرو گے یا میں تمہاری کروں ؟ لیکن انسان کے اندر ایک داعیہ ہے ، جو اسے مصیبت کے وقت کسی نہ کسی کو پکارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں نے جس سے کوئی بھلائی دیکھی ۔ دوسری چیزوں کو چھوڑ کر بس اسی کو پکارا اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ گویا وہ انسان جس کو خدا نے اشرف المخلوقات بنا کر یہ کہا تھا کہ صرف میرے سامنے جھکنا ، باقی تمام کائنات کے تم سردار ہو۔ اس انسان نے خود کو اتنا ذلیل کر دیا کہ ہر چیز کو خدا سمجھ لیا اور ہر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ یہ ہے ہمارے راہبوں اور پیروں کی تعلیم جس نے انسان کو قسم قسم کے شرک میں مبتلا کر کے اتنا ذلیل کر دیا۔

اسی وحدت الوجود کے نظریہ سے مظاہر پرستی کا آغاز ہوا۔ کسی قوم نے سورج کی پرستش کی ، کسی نے آگ کی ، کسی نے فرشتوں کی ، کسی نے درختوں ، پتھروں اور حیوانوں کی اور کسی نے پیروں فقیروں کی یا ان کے آستانوں کی ، کسی نے ان کے مجسموں کی ، تو کسی نے اُن کی قبروں کی پرستش شروع کر دی۔ گویا جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو منع فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود سب شرکیہ افعال دوسری چیزوں کے حضور بجا لاتے رہے۔

بُت پرستی اور قبر پرستی کی ابتداء

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر پرستی اور بُت پرستی کا وجود حضرت نوح علیہ السلام سے بھی بہت

پہلے اس دنیا میں پایا جاتا تھا۔ جب حضرت نوح نے اس قوم سے کہا کہ شرک اور بُت پرستی سے باز آؤ، تو کہنے لگے :

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (۲۳/۷۱)

اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو کبھی ترک نہ کرنا۔

اس کی تفسیر میں امام بخاری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں (علاوہ ازیں یہ روایت احمد، مسلم، نسائی میں بھی مذکور ہے)

إِنَّ هٰؤُلَاءِ قَوْمًا صَالِحِيْنَ فِي قَوْمِ نُوحٍ فَلَمَّا مَاتُوا عَكَفُوا عَلَى قُبُورِهِمْ ثُمَّ صَوَّرُوا تَمَاثِيلَهُمْ فَعَبَدُوهُمْ، ثُمَّ صَارَتْ هٰذَا الْأَوْثَانِ فِي قَبَائِلِ الْعَرَبِ (صحیح بخاری وکتب تفسیر)

یہ سب (وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر) قوم نوح کے اولیاء اللہ تھے۔ جب وہ مرگئے، تو لوگ ان کی قبروں پر اعتکاف کرنے لگے۔ پھر ان کے مجسمے بنائے اور ان کی عبادت کرنے لگے۔ پھر یہی بُت عرب کے قبائل میں پھیل گئے۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوئیں :

۱۔ شرک کا تعلق " اولیاء اللہ" قسم کے لوگوں سے ہوتا ہے۔

۲۔ بُت پرستی کا پہلا زینہ قبروں پر اعتکاف بیٹھنا ہے۔ خواہ یہ وقتی طور پر ہو یا چلّہ کشی کی صورت میں۔

اور یہی دونوں چیزیں "یعنی پیر پرستی اور قبر پرستی" آج بھی مسلمانوں میں عموماً اور دینِ طریقت کے پیروکاروں یا وجودیوں میں بالخصوص رائج ہیں۔ لہٰذا ہم ان پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

یہ آستانے اور درگاہیں

غیر مشروط اطاعت ہی خدائی کا دعویٰ ہے

پیر پرستی سے مراد اپنے پیر کی بلا دلیل شرعی یعنی غیر مشروط اطاعت ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ :

اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۱/۹)

ان (اہلِ کتاب) نے اپنے عالموں اور پیروں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔

تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا، کہ یہ رب بنانا کیا ہے؟ ہم ان کی پرستش تو

نہیں کرتے تھے آپ نے فرمایا: "کیا تم لوگ اُن کی باتیں بلا دلیل تسلیم نہیں کر لیتے تھے؟" عدی بن حاتم نے کہا: "ہاں! یہ تو کرتے تھے۔" تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "رب بنانے سے یہی مراد ہے۔" (ترمذی ابواب التفسیر، سورۃ توبہ)

ہم پچھلے صفحات میں کئی اقتباسات سے یہ واضح کر آئے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح اپنے نووارد مریدوں کو صرف غیر مشروط اطاعت کی شرط پر بیعت کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے اپنا کلمہ بھی پڑھواتے ہیں اور اس طرح انہیں "اپنی پرستش" کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ مریدوں کو اس بات کی بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہر مرید اپنے پیر کو ہر وقت ذہن میں رکھے۔ حتیٰ کہ مرید اس ریاضت میں اتنا پختہ ہو جائے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے بھی مرید، پیر کو یاد کرے یا پکارے تو اُسے پیر کی شکل سامنے نظر آنے لگے اور صورتِ حال یہ ہو کہ ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اس کیفیت کو ان لوگوں کی اصطلاح میں تصورِ شیخ اور اس کی پختہ حالت کو فنافی الشیخ کہا جاتا ہے۔

مشہور اور صحیح حدیث جبریل کا آخری حصہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضورِ اکرم ﷺ سے پوچھا کہ "احسان کیا ہے؟" تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "احسان یہ ہے کہ تو خدا کی ایسے عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سمجھے کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔"

اب دیکھ لیجئے یہ لوگ کس طرح خدا سے بھی زیادہ اپنی پرستش کی تاکید کرتے ہیں۔ اب درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جو تصورِ شیخ، ندار لغیر اللہ، توسل اور استمداد جیسے سب مسائل حل کر دیتا ہے۔ اس کے راوی جناب اعلیٰ حضرت رضا خان بریلوی ہیں:

نداء لغیر اللہ، توسّل اور استمداد

"غالباً حدیقہ ندیہ میں ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت سیدی جنید بغدادیؒ دجلہ پر تشریف لائے اور یا اللہ کہتے ہوئے اس پر زمین کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ بعد میں ایک شخص آیا، اسے بھی پار جانے کی ضرورت تھی۔ کوئی کشتی اس وقت موجود نہ تھی۔ جب اس نے حضرت کو جاتے دیکھا، عرض کیا میں کس طرح آؤں؟ فرمایا یا جنید! یا جنید! کہتا چلا آ۔ اس نے یہی کہا اور دریا پر زمین کی طرح چلنے لگا۔ جب بیچ دریا میں پہنچا شیطان لعین نے دل میں وسوسہ ڈالا کہ حضرت خود تو یا اللہ کہیں اور مجھ سے یا جنید کہلواتے ہیں۔ میں بھی یا اللہ کیوں نہ کہوں۔ اس نے یا اللہ کہا اور ساتھ ہی غوطہ کھایا۔ پکارا حضرت! میں چلا۔ فرمایا "وہی کہہ یا جنید یا جنید!" جب کہا، دریا

سے پار ہوا۔ عرض کی حضرت یہ کیا بات تھی۔ آپ اللہ کہیں، تو پار ہوں اور میں کہوں تو غوطہ کھاؤں۔ فرمایا۔ "اے نادان! ابھی تو جنید تک تو پہنچا نہیں، اللہ تک رسائی کی ہوس ہے، اللہ اکبر۔" (ملفوظات مجدد مائۃ حاضرہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی ص ۱۱۷)

دیکھا آپ نے پیر کو وسیلہ پکڑنے کی کتنی زبردست دلیل ہے، جو امام اہل سنت، موجودہ صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں "غالباً حدیقہ ندیہ" کے حوالہ سے پیش فرما رہے ہیں۔ اور واقعہ بھی ایسا لاجواب گھڑا ہے کہ اس بیچارے کو تسلیم کرنا پڑا کہ میر اللہ کو پکارنا واقعی شیطانی وسوسہ تھا۔ وہ بیچارہ تو یہ خیال کر بیٹھا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا تھا:

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (۲/۱۸۶)

اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہدو) میں (تمہارے) پاس ہوں۔

اس کی بس تلاوت ہی کافی ہے عملی دنیا میں یہ باتیں کام نہیں آتیں۔

سجدۂ تعظیمی اور نظام الدین اولیاءؒ

اب پیر صاحب کی خدائی میں بس ایک سجدہ کرنے کی کسر رہ جاتی ہے، تو اس سے متعلق درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہ میں پھر کچھ دیر اس بارے میں گفتگو رہی کہ مرید حضرت مخدوم کی خدمت میں آتے ہیں۔ آپ کے سامنے زمین پر سر رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ نے، اللہ کا آپ کا ذکر بھلائی سے کرے۔ فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو اس سے منع کروں۔ لیکن چونکہ میں نے اپنے شیخ (شیخ الاسلام فریدالدین) کے سامنے اسی طرح کیا ہے۔ اس لئے میں منع نہیں کرتا۔ اس پر بندے نے عرض کیا کہ وہ لوگ جو حضرت مخدوم کی ذات سے وابستہ ہیں۔ وہ آپکے ارادتمند ہیں اور آپسے انہوں نے بیعت کی ہے، تو ان کی یہ ارادت و بیعت عبارت ہے پیر کے ساتھ عشق و محبت سے پس جہاں عشق و محبت ہوگی زمین پر سر رکھنا ایک سہل سا کام ہے۔ حضرت خواجہ نے، اللہ آپ کا ذکر بھلائی سے کرے، میری اس بات کی مدافعت میں فرمایا کہ ایک دفعہ ایک راستے میں شیخ ابو سعید ابوالخیر ایک گھوڑے پر سوار جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک مرید آگیا۔ وہ مرید پیدل تھا۔ اس نے شیخ ابو سعید ابوالخیر کے زانو کو بوسہ دیا۔ شیخ نے فرمایا کہ اس سے نیچے بوسہ دو۔" اس نے شیخ کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا، "اور نیچے۔" مُرید نے گھوڑے کے زانو کو بوسہ دیا۔ شیخ نے فرمایا، "اور نیچے۔" مُرید نے گھوڑے کے سُم کو بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا "اور نیچے۔" مُرید نے زمین کو بوسہ دیا

اس وقت شیخ نے کہا: "کہ میں نے جو نہیں نیچے اور نیچے بوسہ دینے کو کہا، تو اس سے میرا مقصد یہ نہ تھا کہ تم زمین کو بوسہ دو۔ میرا اس سے یہ مقصد تھا کہ تم جتنا نیچے جاؤ گے تمہارا درجہ بلند ہوگا۔" (فوائد الفواد۔ ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ خواجہ حسن دہلوی، ترجمہ محمد سرور صاحب۔ علما اکیڈمی اوقاف پنجاب لاہور مطبوعہ ۱۹۷۳ء، ص ۴۳۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ نظام الدین اولیاء اکیلے بھی اولیاء (بہت سے ولی) تھے۔

۲۔ خود کو سجدہ کروانے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پیر بھی سجدہ کرواتے تھے۔

۳۔ اس واضح شرک کی اصل وجہ عشق و محبت ہے، جو دینِ طریقت کی بنیاد ہے۔

۴۔ یہ سجدہ تو اپنی بزرگی اور خدائی کے لیے کرواتے ہیں لیکن تاثر یہ دیتے ہیں کہ تواضع سے درجے بلند ہوتے ہیں ؎

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں ۔۔۔ کہ درویشی بھی عیاری وسلطانی بھی عیاری

بھلا اگر تواضع کا سبق ہی دینا تھا، تو اس کا خود کو سجدہ کروانے کے بغیر کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح تواضع کا سبق دیا تھا؟ پھر یہ بھی خیال رہے کہ کتاب فوائد الفواد کو روحِ تصوف کے مصنف خورشید احمد گیلانی نے ان چودہ امہات کتب تصوف میں شمار کیا ہے، جو صحیح روحِ تصوف پیش کرتی ہیں اور سنت کے مطابق ہیں۔

سجدۂ تعظیمی کی حرمت

ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو سجدہ کرنا چاہا، تو آپ نے فرمایا:

مَا هٰذَا يَا مُعَاذُ؟ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ رَأَيْتُهُمْ فِي الشَّامِ يَسْجُدُونَ لِأَسَاقِفَتِهِمْ فَقَالَ يَا مُعَاذُ! إِنَّهُ لَا يَصْلُحُ السُّجُودُ إِلَّا اللهَ وَلَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهِ عَلَيْهَا[1]

معاذ یہ کیا؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ میں نے شام میں دیکھا ہے کہ وہ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "اے معاذ! سجدہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے درست نہیں۔ اگر میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کیونکہ خاوند کا عورت پر بڑا حق ہے۔"

کچھ لوگ سجدہ کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ سجدۂ تحریمی اور سجدۂ تعظیمی۔ اور سجدۂ تعظیمی کو غیر اللہ کے لئے جائز قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں۔ اللہ نے خود فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا۔ اسی طرح حضرت

---

[1] مشکوٰۃ، باب عشرۃ النساء، الفصل الثالث، بحوالہ مسند احمد بروایت حضرت معاذ بن جبل

یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔

مندرجہ بالا حدیث میں ان لوگوں کی دونوں باتوں کے جواب آ گئے ہیں۔ حدیث کے خط کشیدہ الفاظ "تعظم حقہ علیہا" سجدۂ تعظیمی پر ہی دلالت کرتے ہیں نہ کہ تحریمی پر۔ لہٰذا یہ تحریمی و تعظیمی کی تقسیم ہی غلط ہے۔ نیز حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بھی تعظیم کے طور پر آپ کو سجدہ کرنا چاہا تھا نہ کہ سجدۂ تعبدی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پیشتر کی شریعتیں آپ کے بعد منسوخ ہو گئیں۔ اگر پہلے یہ سجدہ جائز تھا بھی، تو آپ کے اس ارشاد کے مطابق قطعی طور پر حرام ہو چکا ہے۔

ولایت یا خدائی؟

اس مبحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ "اولیاء اللہ" جو اپنے مریدوں سے عبدیت کے پورے حقوق (غیر مشروط اطاعت، استمداد و استغاثہ اور سجدہ) وصول کرتے ہیں۔ تو کیا یہ خود معبود کے حقوق پورے بھی کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے حقوق کی تعیین ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ غیب کی بھی سب باتیں جانتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے بندوں کا ہر حال میں نگہبان ہے۔

۲۔ جب اسے پکارا جائے، تو وہ پکارنے والوں کی دعا سنتا، اسے قبول فرماتا، دادرسی کرتا، مشکل سے نجات دیتا، بیماری سے شفا بخشتا اور بندوں کی تمام حاجات پوری کرتا ہے۔

۳۔ اس نے اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر وہ اس کے احکام مانیں گے، تو انہیں دوزخ کے عذاب سے بچائے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ بشرطیکہ اس نے شرک نہ کیا ہو۔

اب ان حقوق کے ثبوت ملاحظہ فرمالیجئے:

۱۔ علم غیب خاصۂ خدا ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور اکرم کو مخاطب کر کے فرمایا:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (۷/۱۸۸)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو کہ میں تو اپنے بھی فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب کی خبریں جانتا ہوتا، تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ علم غیب جاننے کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کسی آنے والی تکلیف سے بچ جائے اور دوسرے یہ کہ آئندہ کے مفید پہلوؤں کو اپنا کر اپنے لئے بہت سی بھلائیاں اکٹھی کر لے، خواہ وہ کسی قسم کی ہوں۔ انہی دو باتوں یعنی دفع ضر اور جلب منفعت کا نام علم تصوف یا دین طریقت کی زبان میں "تصرف" ہے کہ اولیاء اللہ اپنے اور دوسروں کے حالات سے باخبر بھی ہوتے ہیں۔ پھر ان کی مشکل کشائی بھی کر سکتے ہیں اور ان کو "فیض" بھی پہنچا سکتے ہیں، تو اللہ تعالےٰ نے افضل الانبیاء کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے کہ میں تو اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسروں کی رفع حاجات اور مشکل کشائی کیونکر کر سکتا ہوں۔"

۲۔ آیت میں اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ کے الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسب مشیت و ضرورت انبیاء کو تھوڑا بہت علم غیب عطا بھی فرماتا ہے۔ چنانچہ درج ذیل آیت میں بھی اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْہِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ	وہی غیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو
اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ	ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے، تو اس کو
فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ	غیب کی خبریں بتلا دیتا ہے اور اس کے آگے اور پیچھے
خَلْفِہٖ رَصَدًا (۷۲/۲۶)	نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ علم غیب جاننا اللہ تعالےٰ کا خاصہ ہے۔

۲۔ وہ غیب کی خبریں صرف کسی رسول کو ہی دیتا ہے، جسے وہ پسند کرے کیونکہ یہ دنیا کی رہنمائی کے لیے لابدی امر ہے۔

۳۔ پھر اس بات کا بھی اہتمام فرماتا ہے کہ ان خبروں میں ادھر اُدھر سے کہیں باطل کی آمیزش نہ ہو جائے۔

پھر کچھ آیات ایسی ہیں، جن سے غیر اللہ کے علم غیب کی یکسر نفی ثابت ہوتی ہے، مثلاً :

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُہَآ	اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جن کو اس کے
اِلَّا ہُوَ (۶/۵۹)	سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔

اور ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں، جنہیں ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

اب احادیث کی طرف آیئے۔ احادیث سے بھی رسول اکرم ﷺ کا کُلی علم غیب جاننا ثابت نہیں

ہوتا جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو علم غیب بتدریج حاصل ہوتا رہا۔ تا آنکہ آپ کی رحلت کے وقت آپ کو مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنُ (یعنی ازل سے لے کر ابد تک) تمام حالات کا علم تھا اور یہ علم اللہ کے علمِ غیب سے کم نہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور رسول اکرم ﷺ کا علم عطائی، خدا کی طرف سے عطا کیا ہوا تھا۔

رسول اکرم ﷺ کا علمِ غیب کلّی ثابت کرنے کی ضرورت

بیشتر اس کے کہ ہم اس دعوے کا جائزہ لیں یہ بتانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو رسول اکرم ﷺ کا علم غیب کلّی ثابت کرنے کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی ہے کہ اولیاء اللہ کے علمِ غیب کلّی کے لئے راستہ صاف ہو جائے، چونکہ یہ حضرات خود کو تبع رسول ﷺ گردانتے ہیں اور زبانی یہی کچھ کہتے ہیں کہ ہماری بزرگی محض اللہ کے احسان اور رسول ﷺ کی محبت اور اتباع کے سبب سے ہے۔ تو جب تک رسول اللہ ﷺ کا علمِ غیب کلّی ثابت نہ کر لیا جائے یہ اپنے غیب کے دعوے کیسے کر سکتے ہیں؟

اب دیکھئے احادیثِ صحیحہ کی رُو سے ہم چند واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جن سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کو آخری دور تک بھی علمِ غیب (کلّی) نہ تھا، مثلاً:

۱۔ واقعہ تحریم ــــ آپ نے بعض امہات المؤمنین کے کہنے پر شہد کو اپنے آپ پر حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر باز پرس بھی ہوئی۔ اگر آپ کو اس باز پرس کا علم ہوتا، تو آپ ایسا کیوں کرتے۔ (قرآن کریم، سورہ تحریم، بخاری، کتاب الحیل)

۲۔ واقعہ افک ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلے میں آپ ایک ماہ تک بہت پریشان رہے آپ دوسرے لوگوں سے حضرت عائشہ کے کردار سے متعلق استفسار کرتے رہے۔ (قرآن کریم، سورۂ نور، بخاری و دیگر کتب احادیث)

۳۔ زہریلی بکری ــــ جنگِ خیبر کے بعد آپ کو یہودیوں نے زہریلا بکری کا گوشت بطور ہدیہ پیش کیا، جو آپ نے کھا لیا۔ لقمہ اندر چلا گیا، تب آپ کو محسوس ہوا۔ (بخاری و مسلم)

۴۔ مقدمات کے فیصلے ــــ حضور اکرم ﷺ کا فرمان: "تم میرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اپنی دلیل دوسرے فریق کی نسبت اچھی طرح بیان کرتا ہے اور میں جو سنتا ہوں اس پر فیصلہ کر دیتا ہوں۔ پھر اگر میں کسی کو اس کے مسلمان بھائی کا حق (غلطی سے) دلا دوں، تو وہ ہرگز نہ لے۔ میں اس کو دوزخ کا ایک ٹکڑا دلا رہا ہوں۔" (بخاری، کتاب الحیل)

۵۔ حضور اکرم ﷺ کا قیامت کے روز اپنے اُمتیوں کو پانی پلانا اور فرشتوں کا کچھ امتیوں کو حوضِ کوثر سے پرے ہٹانا، تو حضور اکرم ﷺ کے استفسار پر فرشتوں کا یہ جواب دینا کہ :

لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ — آپ نہیں جانتے اِن لوگوں نے آپ کے بعد کیا کچھ بدعات جاری کیں۔ (بخاری و مسلم)

غرض ایسے واقعات بے شمار ہیں، اب ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فیصلہ پر اس موضوع کو ختم کرتے ہیں

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : "جو کوئی تجھ سے یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج میں اپنے پروردگار کو دیکھا وہ جھوٹا ہے اور جو کوئی یہ کہے کہ آپ غیب جانتے تھے وہ بھی جھوٹا ہے۔" (بخاری، کتاب التوحید، باب فلا یظہر علی غیبہ احدًا)

ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا علمِ غیب چاہا اتنا ہی رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا، جو کہ خلقت کی ہدایت کے لئے ضروری تھا اور جو نہ چاہا نہ دیا۔ کلی علمِ غیب ایک ایسا دعویٰ ہے، جو نہ قرآن سے ثابت ہو سکتا ہے نہ احادیث سے اور نہ ہی تاریخ سے۔

۲۔ اولیاء اللہ کے علمِ غیب کی وسعت اور دعویٰ تصرف

لیکن کتاب و سنت کے ان واضح ارشادات کے علی الرغم عبدالوہاب شعرانی کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے شیخ خواص کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "ہمارے نزدیک مردِ کامل اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اپنے مرید کی حرکات کو روزِ میثاق سے لے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک نہ جان لے۔" (کبریتِ احمر برحاشیہ الیواقیت والجواہر، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۵)

۲۔ اور حضرت عزیزاں نے فرمایا کہ : "اولیاء اللہ کی نظر میں تمام زمین دستر خوان کی مانند ہے اور ہم کہتے ہیں۔ کہ ناخن کی مثل ہے۔ ان اولیاء اللہ کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں ہے۔" (نفحات الانس فارسی للجامی، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۶)

۳۔ اور عبدالکریم جیلی صاحب اس سے بھی چند قدم آگے ہیں۔ وہ انبیاء کے معجزات کو نہایت کمتر سمجھتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں کہ :

"منطق الطیر میں ان دونوں پیغمبروں (حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام) کی خصوصیت صرف یہی ہے کہ یہ باتیں بکثرت ان سے ظہور میں آئیں اور اس کا انہوں نے ادعا فرمایا۔ ورنہ جمیع افراد و اقطاب کو

مملکتِ وجود یہ میں تصرف حاصل ہے اور ہر ایک ان میں سے وہ باتیں جانتا ہے، جو رات اور دن میں کھٹکتی (آواز پیدا کرتی) ہیں۔ پرندوں کی بولیاں تو درکنار ہیں۔ چنانچہ شبلی فرماتے ہیں کہ اگر ایک سیاہ چیونٹی اندھیری رات میں سخت پتھر پر چل رہی ہو اور میں اس کی آواز نہیں سنتا، تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں فریب میں آگیا اور ایک اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ نہ میں یہ بات کہتا ہوں، جو شبلی نے کہی اور نہ اس کو سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ (چیونٹی) حرکت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے مگر میری قوت کے ساتھ۔ اور میں ہی اس کا محرک ہوں۔ پھر میں کس طرح کہوں کہ اس کو نہیں جانتا۔" (انسان کامل، ص ۲۴۴)

شاہ عبدالرحیم کا علمِ غیب

انفاس العارفین میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے والدِ محترم شاہ عبدالرحیم صاحب کے متعلق فرمارہے ہیں:

"سننے میں آیا ہے کہ آپ کا ایک خادم کسی بری عادت میں مبتلا تھا۔ آپ نے اُسے کئی بار اشاروں، کنایوں سے تنبیہ فرمائی، مگر وہ پھر بھی نہ چونکا اور نہ ہی اپنی عادتِ بد سے باز آیا۔ بالآخر حضرت شیخ نے اسے تنہائی میں بلا کر کہا "تجھے کئی بار اشاروں کنایوں سے سمجھایا مگر تُو نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ شاید تو سمجھتا ہے کہ ہم تیرے کرتوتوں سے بے خبر ہیں۔ قسم بخدا! اگر زمین کے نچلے طبق میں رہنے والی کسی چیونٹی کے دل میں بھی سو خیالات آئیں تو ان میں ننانوے خیالات کو میں جانتا ہوں۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ اُس کے سو کے سو خیالات سے باخبر ہے۔" یہ سن کر خادم نے اپنی برائی سے توبہ کر لی۔" (انفاس العارفین (اردو)، ص ۲۰۵، مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ترجمہ سید محمد فاروق القادری ایم اے مطبوعہ المعارف لاہور)

اگر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے محدث اور فقیہہ بھی اپنی روایت "سننے میں آیا ہے" سے شروع کریں، تو دوسروں کو ایسی روایات بیان کرنے کا اور بھی زیادہ حق پہنچتا ہے۔ پھر آپ نے عبد اور معبود کے علم میں ننانوے اور سو کی نسبت بیان فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کچھ آپ نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے یا ذرا جھجک گئے ہیں۔

اب وہ واقعہ سامنے لائیے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مجمع البحرین پر حضرت خضر علیہ السلام سے ملے تو ایک چڑیا آئی اور اس سمندر سے چونچ میں پانی کا ایک قطرہ لے گئی، تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسےٰ علیہ السلام سے کہا، "میرے اور تمہارے دونوں کے علم کی خدا تعالیٰ کے علم سے وہی نسبت ہے، جو اس پانی کے قطرہ کی جو چڑیا لے گئی، اس سمندر سے ہے۔ حالانکہ ان دونوں بزرگوں کو اللہ کی طرف سے علم یقینی حاصل ہوتا تھا اور شاہ عبدالرحیم کا علم کشفی اور ظنی ہے۔

میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) کے شاگرد کا علم غیب

کچھ لوگ میاں جی کے پاس آ کر توجہ کے طالب ہوئے آپ بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ آپ بچوں کو یہ کہہ کر کہ "پڑھتے رہو" انہیں حجرہ میں لے گئے اور توجہ ڈالنا شروع کی، جو بچہ عمر میں بڑا تھا اس نے حجرہ کے دروازہ کی دراڑ سے یہ منظر دیکھا، تو واپس آ کر لڑکوں میں اس کی نقالی شروع کر دی اور خود پیر بن بیٹھا اور بچے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ جب میاں جی کو معلوم ہوا، تو آپنے اس بڑے لڑکے کو بلا کر اسے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ وہ بہت جلد تاب نہ لا کر چلا گیا۔ جب جوان ہوا تو اس نے بتلایا کہ جب میں میاں جی کے سامنے بیٹھا، تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دل پہ چنگاری رکھ دی ہے۔ جو فوراً اٹھالی گئی، مگر اب تک حال یہ ہے کہ اندھیری رات میں، سردی کے موسم میں، مکان کے اندر، لحاف میں منہ رکھنے کے باوجود باہر جو نیم کا درخت ہے اس کے پتوں کی حرکت تک معلوم ہوتی ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۳۹)

علی ہجویریؒ کا علم غیب اور اختیار و تصرف

درج ذیل واقعہ حضرت علی ہجویریؒ سے تعلق رکھتا ہے:

"ایک دفعہ میں نے دمشق کے درویشوں کے ساتھ ابن المعلا کی زیارت کے لئے جانے کا قصد کیا۔ یہ رملہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ راستہ میں ہم نے آپس میں باتیں کیں کہ کچھ سوچ لو تاکہ وہ حضرت ہمیں ہمارے باطن سے مطلع کریں اور ہماری مشکل حل ہو۔ میں نے دل میں سوچا کہ مناجات ابن حسین کے اشعار ان سے سنوں۔ دوسرے نے سوچا مجھے طحال کا مرض ہے، یہ اچھا ہو جائے۔ تیسرے نے کہا مجھے حلوہ صابونی ان سے لینا ہے۔ جب ہم ان کی خدمت میں پہنچے، تو انہوں نے ایک جزو کاغذ جس میں اشعار مناجات ابن حسین لکھے تھے میرے آگے رکھ دیئے اور دوسرے کے طحال پر ہاتھ پھیرا وہ جاتی رہی۔ تیسرے کو کہا حلوہ صابونی سپاہیوں کی غذا ہے۔ اور تو اولیاء کا لباس رکھتا ہے اور اولیاء کے لباس والے کو سپاہیوں کی غذا کا مطالبہ درست نہیں، دونوں میں سے ایک بات اختیار کر۔" (کلام المرغوب ترجمہ کشف المحجوب مصنفہ حضرت علی ہجویریؒ، ص ۵۴۴)

اس روایت سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا مزاج ہی ایسا بن گیا ہے کہ ان کو صرف باطن کی اطلاع سے ہی بزرگی کا یقین آتا ہے۔ دوسرے پیر صاحبان بھی اسی معیار کو پسندیدہ قرار دے کر ان کے مطالبہ کو پورا کرنے کے عادی بن گئے ہیں۔ بہرحال یہ بزرگ امتحان میں پوری طرح کامیاب ہیں اور ان کے علم غیب اور ساتھ ہی تصرف فی الامور میں داد دینے کے بغیر چارہ نہیں۔

عثمان ہارونی کا تصرف اور طیّ الارض

" اس پیر مرد نے اپنا احوال (خواجہ عثمان ہارونی سے) کہنا شروع کیا کہ آج تیس برس کا عرصہ ہوا کہ میرا لڑکا مجھ سے جُدا ہے اور کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے مرنے جینے کی کچھ خبر تک معلوم نہیں۔ اس کی دردِ جدائی سے میرا بُرا حال ہے۔ اور اب میں آپ کی خدمت میں آیا ہوں اور اس کے آنے اور صحت و سلامتی کے لئے فاتحہ و اخلاص کی درخواست کرتا ہوں۔ جب خواجہ عثمان ہارونی نے یہ بات سنی، تو مراقبے میں سر جھکایا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس پیر مرد کے گُم شدہ لڑکے کے آنے کے لئے فاتحہ و اخلاص پڑھو۔ جب آپ اور سب درویشوں نے فاتحہ و اخلاص ختم کی تو پیر مرد سے کہا: "جاؤ! اور ایک لحظے کے بعد اپنے لڑکے کو ملاقات کے واسطے ہمارے پاس لے آؤ۔"

" جونہی پیر مرد نے زبان مبارک سے یہ سنا فوراً رُو برو خواجہ کے سر جھکا کے واپس گیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ کسی نے پیر مرد کا ہاتھ پکڑ کے کہا: "مبارک ہو، تمہارا لڑکا آگیا۔ خوشی خوشی گھر میں آیا اور لڑکے سے ملاقات کی۔ اس پیر مرد کی آنکھیں ضعیف ہو گئی تھیں، لڑکے کو دیکھتے ہی روشن ہو گئیں، لٹے پاؤں لڑکے کو لے کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لڑکے کو پابوس کرایا۔"

" خواجہ علیہ الرحمۃ نے اس لڑکے کو آگے بلا کے پوچھا: "میاں! تم کہاں تھے؟" اس نے کہا: "سمندر میں کشتی پر تھا۔ صاحب کشتی نے پکڑ کر زنجیر سے جکڑ رکھا تھا، آج میں اسی جگہ بیٹھا تھا کہ ایک درویش، آپ کی شبیہ، گویا آپ ہی تھے، آئے اور میرے پاؤں کی زنجیر توڑ کر گردن زور سے پکڑی اور اپنے آگے مجھ کو کھڑا کیا۔ اور فرمایا: "اپنا پاؤں، میرے پاؤں پر رکھ لے اور آنکھیں بند کر۔" جیسا درویش نے حکم کیا، میں نے وہی کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا: "کہ آنکھیں کھول۔" میں نے جو آنکھیں کھولیں، تو اپنے آپ کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے پایا۔" (دلیل العارفین ملفوظات خواجہ معین الدین چشتی، مرتبہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، ترجمہ: غلام احمد بریاں، ص ۸۲-۸۳)

دیکھئے ان خواجہ صاحب کے مقابلہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کیسے بے بس نظر آتے ہیں اور خواجہ صاحب ہیں کہ بیٹھے بٹھائے ایک لمحہ میں کیا کچھ کر دکھایا۔ اس واقعہ میں کئی پیغمبروں کے معجزات پنہاں ہیں اور یہ سب کچھ سورۃ فاتحہ و اخلاص کی برکت اور حضرت خواجہ کی بزرگی کے طفیل ہوا۔ جس پیغمبر پر سورۃ فاتحہ اور اخلاص اتری اور جن بزرگوں کو اس پیغمبر نے ان سورتوں کی تعلیم دی وہ تو سب ان سورتوں کے اس قسم کے فوائد سے ناآشنا ہی رہے جو ان اولیاء اللہ نے ڈھونڈ نکالے ہیں کہ ادھر مراقبہ میں پڑے اور آن کی آن میں لڑکے کو سمندر سے اور زنجیریں توڑ کر گھر چھوڑ آئے ہیں۔

پیرانِ پیر کی حاجت روائی اور مشکل کشائی

اب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے، جس سے آپ کی دستگیری، حاجت روائی اور مشکل کشائی بھی ثابت ہوتی ہے اور توسّل و استمداد کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

"حضرت شیخ نے فرمایا کہ منصور حلاج کے زمانہ میں کوئی ان کی دستگیری کرنے والا اور جس لغزش میں وہ مبتلا ہوئے، کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ اگر میں اُن کے زمانہ میں ہوتا تو ان کی دستگیری کرتا اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ قیامت تک میں اپنے مُریدوں کی دستگیری کرتا رہوں گا اگرچہ وہ سواری سے گرے اور فرمایا کہ ہر طویلہ میں ایک ناقابلِ مقابلہ سانڈ اور ایک ناقابلِ مسابقت گھوڑا رہتا ہے اور فرمایا کہ ہر ایک لشکر پر میرا تسلط رہتا ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں کرتا اور ہر منصب میں ایسا خلیفہ ہے جسے ہٹایا نہیں جا سکتا۔"

"فرمایا کہ جب بھی اللہ سے کوئی چیز مانگو، میرے وسیلہ سے مانگو تاکہ مراد پوری ہو اور فرمایا کہ جو کسی مصیبت میں میرے وسیلہ سے امداد چاہے، تو اس کی مصیبت دُور ہو اور جو کسی سختی میں میرا نام لے کر پکارے اُسے کشادگی حاصل ہو، جو میرے وسیلہ سے اپنی مرادیں پیش کرے تو پوری ہوں۔"

صلوٰۃِ غوثیہ کے فائدے

"آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سرکارِ دو عالم ﷺ پر درود بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی حاجت برلائے۔ ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے۔"

(اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی، مترجم اردو) مولانا سبحان محمود، ص ۱۴۹، ۱۵۰)

غور فرمائیے! کہ اس پورے بیان میں صرف آخری روایت ثابت نہیں، باقی سب کچھ بلاشک و شبہ تحقیق شدہ ہے اور یہ بات ہے بھی قرینِ قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو وہاں صرف اقدام جانب عراق (بغداد جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر عراق کی جانب تلاش کرنے کی تکلیف سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب دیکھئے! اس نماز کو ضیاء اللہ قادری نے سیرت غوث الثقلین میں صفحہ ۲۴۲ پر "صلوٰۃ غوثیہ" کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے۔ پھر اس 'صلوٰۃ غوثیہ' کے راوی یہ اکیلے عبدالحق "محدث" صاحب ہی نہیں۔ مندرجہ ذیل

تذکرہ نگار بھی ہیں :

۱۔ بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۲ ابوالحسن نورالدین شنطوفی ۲۔ قلائد الجواہر، ص ۳۶ ، علامہ محمد بن یحیٰ حلبی

۳۔ نزہتہ الخاطر الفاتر، ص ۹ ، علامہ ملا علی قاری ۴۔ تفریح الخاطر، ص ۵۶ ، علامہ عبدالقادر الاربلی

۵۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۴، ۴۸، ابوالمعالی محمد سلی قادری ۔

اور امام اہلِ سنت احمد رضا خان نے تو اس نماز کے جواز میں ایک نہایت ہی مدلل رسالہ " اَنْھَارُ الْاَنْوَارِ مِنْ یَمِّ صَلوٰۃِ الْاَسْرَارِ " بھی تحریر فرمایا۔ گویا آپ نے اسرار کے سمندر میں سے نور کی نہریں جاری کر کے نماز کے جواز کے ثبوت دلائل مہیا فرما دئے ہیں۔

اور صاحب ریاض السالکین نے اس نماز کا دوسرا نام " صلوٰۃ الاسرار دوگانہ ضرب الاقدام " بتلایا ہے اور اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے ۔

۱۔ شب یکشنبہ کو غسل کر کے خوشبو لگا کر صاف کپڑے پہن کر پاک جگہ پر بیٹھے اور نیت صلوٰۃ الاسرار ہدیہ دربار پیرانِ پیر کرے ۔

۲۔ سلام کے بعد ۱۱بار اغثنی یارسول اللہ پھر ۱۱ بار الٰہی بحرمۃ غوث الثقلین اقض حاجتی پڑھے ۔

۳۔ نماز سے فراغت کے بعد ۱۱ قدم جانب عراق چل کر کھڑا ہو جائے اور ۱۱ مرتبہ غوث پاک کی رُوح پر سلام بھیج کر اپنا دلی مطلب عرض کرے ۔ (ریاض السالکین، ص ۳۱۴)

اب سوچئے نہیں بلکہ رویئے کہ جہاں شرک و بدعات کا یہ عالم ہو، وہاں ایاک نعبد وایاک نستعین کی کچھ حیثیت رہ جاتی ہے اور اس سے عجیب تر یہ معاملہ کہ یہ سب کچھ پیرانِ پیر کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔

عبدالقدوس گنگوہی کی کرامات

اب ایک علمی مجلہ ماہنامہ " دارالعلوم " دیوبند کے ایک مضمون سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے :

(عنوان ہندو جوگی سے مقابلہ)

" جس وقت آپ (قطب عالم عبدالقدوس گنگوہی) تکمیلِ علوم باطنی کے بعد گنگوہ تشریف لائے ہیں اس وقت یہاں ایک باکمال جوگی رہتا تھا جس کی کٹی نہایت وسیع اور پُر فضا تھی۔ آپ کو یہ جگہ بہت پسند

آئی اور قیام کی خواہش پیدا ہوئی۔ اندر جاکر چیلوں سے پوچھا کہ بتلایئے آپکے گرو جی کہاں ہیں ؟ بولے وہ تو کٹی کے اندر گئے ہیں۔ ایک سال گزر چکا ہے۔ ہوا کے لئے صرف ایک روزن ہے، کیا مجال ہے، جو کوئی اس کے قریب جائے۔ آپ اس روزن کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مراقبہ جو کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حبسِ دم کئے ہوئے بیٹھا ہے اور اپنے کام میں مصروف ہے۔ آخر آپنے اس کی روح کو حرکت دی۔ ساتھ ہی وہ ہوشیار ہو گیا۔ پوچھا تو کون ہے ؟ اور کس طرح اندر آگیا۔ فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اسی کی قدرت سے اس سوراخ کے ذریعہ اندر آگیا ہوں، مگر تو یہ تو بتا کہ کس حد تک ترقی کر چکا ہے ؟ بولا کافی ترقی کر لی ہے، جو صورت چاہوں اختیار کر سکتا ہوں، دیکھو ! ابھی پانی بنتا ہوں، چنانچہ وہ اسی وقت پانی ہو گیا۔ آپنے فوراً ہی اس پانی میں دھجی تر کرکے رکھ لی۔ اس کے ہوش میں آتے ہی فرمایا کہ اب میں پانی ہوتا ہوں، تو اس میں ایک کپڑا تر کرکے رکھ لینا۔ اس کے بعد یہ کپڑے سونگھے گئے تو ایک میں بد بو تھی، تو دوسرے میں خوشبو۔ ایک کی وجہ سے دماغ پریشان ہوا جاتا تھا اور دوسرے کی خوشبو سے معطر۔ جوگی بولا کہ "میں تو اپنے فن و ہنر میں کامل تھا ہی، آپ بھی کامل نکلے، صرف خوشبو اور بدبو کا فرق رہا" فرمایا : "یہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔" چنانچہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور مرید ہو کر تکمیل کر لی۔ اس جوگی کو آپنے صاحبِ ولایت مقرر کرکے کہیں اور بھجوا دیا حضرت کا روضہ اسی جگہ ہے۔ وصال کے بعد بھی قلب بدستور ذکر و حرکت میں مصروف تھا۔" (ماہنامہ "دار العلوم" دیوبند، جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۴۔ نگرانِ اعلیٰ : قاری محمد طیب صاحب، مدیر: ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر)

اقتباسِ بالا سے مندرجہ ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں :

۱۔ بزرگانِ کرام کسی غائب کی روح کو جھنجوڑ سکتے ہیں، باریک سے سوراخ سے گزر سکتے ہیں اور اپنی اشکال بدل سکتے ہیں۔ یہ سب کام تو غالباً جنوں یا فرشتوں کے ہو سکتے ہیں۔ کسی نبی سے کوئی معجزہ یا کسی صحابی سے ایسی کرامات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔

۲۔ ایسی کرامات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں کے بزرگ بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ عبد القدوس گنگوہی اور ہندو جوگی کا باطن یا فن ایک ہی تھا۔

۳۔ البتہ یہ فرق ضرور باقی رہتا ہے کہ مسلمان کے جسم سے (یا جو شکل بھی وہ بدلے) کلمہ طیبہ کی برکت سے خوشبو آتی ہے لیکن کافر کے بدن سے کلمہ کفر کی وجہ سے بدبو آتی ہے اور یہ فرق بزرگوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ سبحان اللہ ! کلمہ پاک کی پاکیزگی کو کس مقام پر جا کر فٹ کیا ہے ؟ اللہ تعالیٰ نے جو کلمہ طیبہ

اور کلمہ خبیثہ یا اسلام اور کفر کی تمثیل پیش کر کلمہ طیبہ کے جو فوائد تبلاتے ہیں، کیا ان کی اس فائدہ سے کوئی نسبت ہے ؟

۴۔ اور یہ فائدہ اتنا عظیم تھا کہ وہ کامل جوگی (بزرگ) فوراً مسلمان ہوگیا اور اس کے سب چیلے بھی۔ پھر آپ نے اسی وقت اس کو صاحب ولایت بھی مقرر کر دیا اور علامہ ارملی کے بیان کردہ اس دستور کی خلاف ورزی بھی کی کہ قیامت تک کے لئے قائم ولایت پیران پیر ہیں۔

۵۔ گنگوہی صاحب کا مقرر کردہ یہ نائب تو اسلامی تعلیمات خود بھی نہ جانتا تھا، دوسروں کو کیا سکھا سکتا تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ علم وفن یہ حضرات سیکھتے ہیں اسے ہی انہوں نے اسلامی تعلیمات کا نام دے رکھا ہے۔ اور یہی کچھ ان اولیاء اللہ حضرات نے ہند میں اسلام پھیلایا تھا۔

۶۔ حرکت قلب کے بند ہو جانے کا نام ہی موت یا وصال (شریف) ہے۔ مگر آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کا دل حرکت بھی کرتا رہا اور ذکر بھی کرتا رہا۔ پھر یہ وصال کی بات کیسی ؟ صاف کہنا چاہئے کہ مرنے کے بعد بھی بدستور زندہ رہے یا فوت ہی نہیں ہوئے۔

پھر آپ کی یہ خوشبو اس قدر پختہ ہو گئی کہ آپ اپنے ایک مرید سے محض اس لئے بگڑ بیٹھے تھے کہ تمہیں ہماری خوشبو کیوں نہیں آئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ آپ کے کسی مُرید نے اپنے لڑکے کی دعوت ولیمہ میں امراء اور غرباء سب کو مدعو کیا۔ آپ بھیس بدل کر مجلس غرباء میں جا بیٹھے اور دیکھا کہ اُمراء اور غرباء سب کی ایک جیسی تواضع ہو رہی ہے آپ کا مُرید وہاں موجود تھا، لیکن اپنے شیخ کو پہچان نہ سکا۔ پھر جب مجلس میں آیا، تو آپ کو ناراض دیکھ کر وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: "ہم تمہاری دعوت میں گئے اور تم نے ہمیں پہچانا نہیں۔" اس نے کہا: "میں بھلا اس حالت میں آپ کو کیسے پہچان سکتا تھا؟" فرمایا: "اگرچہ ہم نے لباس تبدیل کیا ہوا تھا، مگر تمہیں ہمارے اندر سے خوشبو کیوں نہیں آئی ؟ اور جب خوشبو نہیں آئی تو معلوم ہوا تم کو ہم سے محبت نہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا ص ۲۰۶)

پیرانِ پیر اور جنس میں تبدیلی

بلا تبصرہ:

"شاہ ابو المعالی فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بارگاہِ غوثیہ میں آکر لڑکے کے لیے التجا کی۔ آپ نے اس کے حق میں دُعا فرمائی اور وہ روزانہ آپ کی مجلس میں آنے لگا۔ اتفاق سے اس کے ہاں لڑکی پیدا ہو گئی، تو اس نے عرض کیا کہ "ہم نے تو لڑکے کے لئے کہا تھا اور یہ تو لڑکی ہے۔" آپ نے فرمایا: "اسے لپیٹ کر گھر لے جاؤ اور پردۂ غیب سے قدرت کا کرشمہ دیکھو۔" چنانچہ جب اس نے گھر لا کر کپڑا ہٹایا

تو لڑکی کے بجائے لڑکا پایا۔" (تفریح الخاطر، ص ۱۸۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۱۷۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۵۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۰۳)

اولیاء اللہ کا موت و حیات پر تصرف

تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موت و حیات محض اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہ بات نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہے۔ کسی انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کب اور کہاں مرے گا، لیکن یہ "بزرگ حضرات" اس پابندی سے بھی آزاد ہیں۔ وہ جب چاہیں مر سکتے ہیں۔ اب مندرجہ ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ عنوان ہے حضرت عبداللہ منازل:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا کہ .... (یہاں سے کچھ عبارت رہ گئی ہے)..... کرے۔ کیونکہ اب اس کی عمر صرف ایک سال باقی ہے۔" اس نے آکر آپ سے کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا: "یہ مدت تو بہت لمبی ہے۔ سال کا انتظار کون کرتا پھرے۔ نہ معلوم سال کب ختم ہو۔ یہ کہہ کر ہاتھ بجائے تکیہ سرہانے پر رکھا اور کہا: "لو میں چلا" پھر رحلت کی۔" (مقربانِ حق ص ۲۱۰)

۲۔ حضرت علی سہیل اصفہانی کی بات ہو رہی ہے:

"نقل ہے کہ ایک بار آپ نے اپنے دوستوں سے فرمایا: "تم خیال کرتے ہو کہ میری موت تمہاری موت کی طرح ہوگی، یعنی بیمار پڑوں گا اور لوگ بیمار پرسی کو آئیں گے، نہیں! میری موت اس طرح ہوگی کہ وہ پکاریں گے اور میں حاضر ہو جاؤں گا۔" چنانچہ ایک دن آپ دوستوں کے ساتھ جا رہے تھے کہ اچانک ایک صاف جگہ لیٹ گئے اور کہا: "لبیک! لبیک!" پاس ہی حضرت ابوالحسن تھے۔ انہوں نے یہ حالت دیکھی، تو کلمہ شریف کی تلقین کی۔ آپ مسکرائے اور کہا: "مجھ کو تلقین کرتا ہے۔ اس کی عزت کی قسم! میرے اور اس کے درمیان صرف عزت کے پردہ کے سوا کوئی چیز حائل نہیں۔" (مقربانِ حق، ص ۲۱۶)

اب وہ منظر سامنے لائیے جن حالات میں حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تھی۔ آپ نے مسلمانوں کو کلمہ شریف پڑھنے کی تلقین بھی کی ہے اور اس وقت مسلمان کلمہ شریف اور قرآن پڑھ بھی رہے تھے۔ لیکن آپ کو ایسا "جلال" نہیں آیا۔

۳۔ شیخ فرید الدین عطار کا ذکر ہو رہا ہے:

"آپ ایک کارخانہ ادویہ کے مالک تھے۔ ایک دن کاروبار میں مصروف تھے کہ کسی فقیر نے آکر صدا لگائی کہ خدا کے نام پر کچھ دو۔ یہ مخاطب نہ ہوتے اس نے کئی بار صدا لگائی۔ یہ اس قدر منہمک تھے کہ

جواب دینے کی فرصت نہ پائی۔ اس نے کہا کہ مشغولیت کا یہ عالم ہے، جان کیسے دوگے؟ انہوں نے جھنجلا کر کہا "جیسے تم دوگے"۔ اس نے کہا "بھلا میری طرح کیا دوگے؟" یہ کہہ کر کاسہ گدائی سر کے نیچے رکھا۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام، از آقا بیدار بخت، ص ۴۷)

موت کے وقت میں تبدیلی

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے، تو کوئی اسے ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں کر سکتا، لیکن یہ حضرات اس وقت کو آگے پیچھے کر سکتے ہیں اور کسی ایک کی جگہ دوسرے پر بھی موت وارد کر سکتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱)۔ حضرت ابوالحسن خیر النساج کا ذکر چل رہا ہے:

"نقل ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو نماز کا وقت بھی ہوگیا۔ ملک الموت حاضر ہوئے آپ نے سر اٹھا کر خوش آمدید کہا اور فرمایا: "اللہ آپ کو معاف کرے، ذرا ٹھہریئے! میں اور آپ دونوں خدا کے فرمانبردار بندے ہیں۔ آپ کو جو حکم ملا ہے ٹل نہیں سکتا، لیکن جو مجھے حکم ہے اس کا وقت فوت ہوا جاتا ہے۔ ذرا توقف کیجئے تاکہ نماز پڑھ لوں۔ پہلے میری طرف سے تعمیل ہو جائے، پھر آپ کر لیں۔" چنانچہ آپ نے وضو کیا، نماز پڑھی اور جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔" (مقربانِ حق، ص ۱۵۴)

سوال یہ ہے کہ:

۱۔ آپ نے جس نماز کے لئے ملک الموت کو انتظار کرایا اس کے آپ مکلف کب تھے؟

۲۔ آپ ملک الموت کو فرما رہے ہیں "اللہ آپ کو معاف کرے" حالانکہ نہ وہ مکلف ہے۔ نہ اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے، تو پھر معافی کیسی؟

(۲) "نقل ہے کہ محی الدین ابنِ عربی کو بادشاہِ وقت نے کہا: "میری لڑکی بیمار ہے آپ آکر عیادت کریں تو شاید آپ کی برکت سے شفا ہو۔" آپ نے جا کر کہا کہ "عزرائیل تو روح قبض کرنے آگیا ہے۔" بادشاہ آپ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا: "اس کا علاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔" ابنِ عربی نے عزرائیل سے کہا: "ٹھہر! ہم اپنی لڑکی تمہارے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں۔" پھر گھر آئے اور دروازے کی طرف منہ کر کے فرمایا: "عزرائیل یہ لڑکی حاضر ہے۔ لڑکی اسی وقت زمین پر گر پڑی اور مر گئی اور بادشاہ کی لڑکی اچھی ہو گئی۔" (مرشدِ کامل، ترجمہ حدائق الاخبار، صادق فرغانی، ص ۲۳)

دیکھ لیجئے! خدائی کس کی چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یا ابنِ عربی کی؟ پھر حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ساتھ

بھی کیسی راز و نیاز اور سمجھوتے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

کُلّی تصرّف کا ثبوت پیرانِ پیر کی زبان سے

شیخ عبد القادر جیلانی 'فتوح الغیب' میں مقامِ ولایت میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کُتبِ انبیاء سابقین میں فرمایا: "اے اولادِ آدم! میں ہی وہ اللہ ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں جب میں کسی چیز کو کہہ دیتا ہوں "کُن" ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس جب تم میری اطاعت اور فرمانبرداری کرو گے، تو میں تمہیں اسی مقام پر فائز کروں گا کہ تو بھی جب کسی چیز کو کہے گا "کُن" ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم میں سے بے شمار انبیاء کرام، اولیاء کرام اور خواص کو اس صفت اور مرتبہ سے نوازا ہے۔"

(فتوح الغیب، مقالہ نمبر ۱۶ بر حاشیہ بہجۃ الاسرار، ص ۳۸ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۲۰۵)

اب دیکھئے اقتباسِ بالا میں پیرانِ پیر نے "بعض کُتبِ انبیاء سابقین" پر انحصار فرمایا۔ کتاب و سنّت کو کافی نہ سمجھا۔ شاید اس لئے کہ کتاب و سنّت سے تو ایسی بات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ پھر آپ نے ان بعض کُتب انبیاء سابقین کا حوالہ دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ اسی سے آپ کے ارشاد کی ثقاہت کا پتہ چل جاتا ہے اور اس طرح آپ نے اپنے سمیت اللہ تعالیٰ کے کئی شریکوں کا جواز پیدا کر دیا۔ خط کشیدہ الفاظ ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیے اور بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، وہ بھی چند مخصوص باتوں میں، کسی نبی کو بھی یہ قدرت عطا فرمائی تھی؟ یہ بے شمار انبیاء، اولیاء اور خواص کہاں سے آ گئے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق یہ قدرت عطا فرما دی۔

پھر شیخ عبد الحق محدث دہلوی اسی فتوح الغیب کے اس کلام کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"ان حضرات (انبیاء، اولیا، خواص) میں سے ایک غوث پاک کی ذات بھی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کائنات میں تصرف اور اقتدار حاصل ہے۔ درحقیقت ہر حال و مقام میں جو ان مقالات میں مذکور ہیں۔ وہ اپنے حال شریف کا کنایۃً اظہار ہے۔" (شرح فتوح الغیب، ص ۱۰۸، بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۰۶)

اب دیکھئے محدث صاحب کا پہلا جملہ اپنے الفاظ و معانی میں بالکل صاف اور واضح ہے اور ہر شخص اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات کتاب و سنت کی رُو سے صریح شرک ہے، لیکن محدث صاحب کا دامن ادھر بھی الجھا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ کو "اپنے حال شریف کے کنایۃً اظہار" کہنے کی ضرورت پیش آ گئی کہ اس طرح وہ شیخ جیلانی صاحب کی تنزیہہ بھی کر سکیں اور اپنے دل کو کسی حد تک مطمئن بھی۔

علامہ آلوسی اپنی کتاب "غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی" میں تصرف فی الکائنات کے اس مشرکانہ عقیدہ کی ہمہ گیری کے متعلق نہایت درد سے یہ واقعہ درج فرماتے ہیں:

اس عقیدہ پر علامہ آلوسی کا اظہارِ افسوس

اہلِ اسلام کے موحدین کی ایک جماعت ایک مصری کے گھر جمع ہوئی۔ اس کے قریب ہی ایک آدمی تھا، جس کو علم کا دعویٰ تھا۔ اس کو اہلِ خانہ نے پیغام بھیجا اور اس سے حاضرین کی موجودگی میں سوال کیا کہ "کتنے لوگ کائنات میں تصرف کرتے ہیں؟" اس نے جواب دیا "جناب سات آدمی!" پھر پوچھا گیا، "کون کون؟" اس نے جواب دیا، "فلاں فلاں" اور مصر کے چار معبودوں (بدوی، رفاعی، دسوقی اور ابو العلاء) کے نام لئے۔ اہلِ خانہ نے موجود موحدین سے کہا: "میں نے آپ کے سامنے اس سے اس لئے پوچھا ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ شرک کہاں تک اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔"

۳۔ توجہ، بیعت اور شفاعت

توجہ کے کرشمے

حکیم الامت اشرف علی تھانوی، جنید بغدادیؒ کی عظمت میں یوں رطب اللسان ہیں۔

"۲۲۸۔ فرمایا حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ آپ کی نگاہ[1] اس پر پڑ گئی۔ اس قدر صاحبِ کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔" (امداد المشتاق، مؤلفہ حکیم الامت اشرف علی تھانوی، ص ۱۰۲)

لیجئے اب کتے بھی صاحبِ کمال و صاحبِ حال ہونے لگے۔ یہ مخلوق تو غیر مکلف ہے۔ اس بیچارے کو خواہ مخواہ ہی صاحبِ حال بنا دیا اور لطف یہ کہ یہ نگاہ اتفاقاً پڑ گئی۔ اگر باقاعدہ توجہ فرماتے، تو نہ معلوم وہ کتا کتنے بلند مقام پر فائز ہوتا۔ اگر اتفاقاً نگاہ پڑ جانے کا اتنا ہی اثر ہے، تو پھر تو اس دَور کے انسان، جن پر آپ کی

---

[1] یہی اشرف علی صاحب تھانوی بزرگوں کی توجہ کے متعلق ایک دوسرے مقام پر یوں رقمطراز ہیں:

"یہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے، جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا، مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آج کل کے مسمریزم اور عملِ تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ، تصرف یا ہمت ہے ...... لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال نہیں۔ نہ مقبول و مردود ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی اپنے اندر مشق سے یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔" (تجدید تصوف و سلوک ص ۹۲)

نظر پڑی سب کے سب اولیاء اللہ ہو گئے ہوں گے ؟

نظرِ کرم کی فیوض و برکات

پھر یہ توجہ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کسی کو فیض پہنچاتی ہے یا اُسے ولی یا صاحب کرامت بنا دیتی ہے اور اسے نظر کرم کہتے ہیں۔ جنید بغدادی کی کتے پر "نظرِ کرم" ہی پڑی تھی۔ اب اس نظرِ کرم کے مختلف برکات و فیوض ملاحظہ فرمایئے !

۱۔ ایک بزرگ ابُو ہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) ہیں۔ "آپ کا جو شخص منظورِ نظر ہو جاتا۔ ایک توجہ سے فوراً اس پر علوم منکشف ہو جاتے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۷)

۲۔ پیرانِ پیر (م ۵۶۱ھ) نے جب شہاب الدین سہروردی پر ایک نگاہ ڈالی، تو علم کلام کی جُملہ پڑھی ہوئی کتب ان کو یکسر محو ہو گئیں تھیں۔

۳۔ اس طرح عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) نے مولانا جلال الدین (جو انہیں ناچا پیر کہا کرتے تھے) کے جُملہ علوم کو ایک توجہ سے زائل کر دیا تھا۔ (حوالہ ایضاً، ص ۲۱۱)

۴۔ حضرت احمد جام نے ایک کُند ذہن طالب علم پر نظر ڈالی، تو اتنے بلند پایہ مضامین منکشف ہوئے، جو عام انسانی سطح سے بہت بلند تھے۔ (مرشدِ کامل، ص ۲۴)

۵۔ میاں اسمٰعیل لاہوری المعروف میاں کلاں نے صبح کی نماز کے بعد سلام پھرتے وقت جب نگاہ کرم ڈالی تو دائیں طرف کے مقتدی سب کے سب حافظِ قرآن بن گئے تھے اور بائیں طرف کے ناظرہ پڑھنے والے۔ (حدیقۃ الاولیا، ص ۱۷۶)

۶۔ ابواحمد ابدال چشتی (م ۳۵۵ھ) جس شخص پر نظر ڈالتے تھے، صاحب کرامت ہو جاتا تھا۔ (تاریخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۴)

۷۔ میاں جی نور محمد (۱۲۷۴) نے جب اپنے ایک شاگرد پر توجہ ڈالی، تو اس کے اثر سے وہ سردیوں کے موسم میں، کمرہ میں، لحاف کے اندر صحن میں نیم کے درخت کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک سن لیتا تھا۔ (حوالہ ایضاً، ص ۲۳۹)

نگاہِ جلالیت کی تباہ کاریاں

پھر یہی توجہ جب کسی کو نقصان پہنچانے یا جان سے ختم کر دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہے، تو اسے نگاہِ جلالیت " کہتے ہیں۔ ان اولیاءاللہ کی دنیا میں اس قسم کی توجہ کی بھی بے شمار مثالیں ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ ابو یوسف ہمدانی (م ۵۳۵ھ) نے دو فقہاء کو یہ کہہ کر "تم خاموش رہو، زندہ نہ رہو" مار دیا تھا

ان کا قصور یہ تھا وہ فقہاء آپ کو بدعتی کہتے تھے ۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۲۹)

۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) نے اپنے ایک مرید کو ایک ہی نگاہ میں مار دیا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی تقریر میں نعرہ لگایا تھا۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۷)

۳۔ علاء الدین صابر کلیری (خلیفہ فرید الدینؒ گنج شکر) نے تو مسجد کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر سب نمازیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ قصور اُن کا یہ تھا کہ اُنہوں نے آپ کو امام کے مصلّٰی سے اٹھا دیا تھا۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۷)

پھر آپ کی یہ جلالیت اتنی ہمہ گیر تھی اور جلال اتنا غالب تھا کہ وصال کے بعد بھی مزار پر ایک شعلہ چمکتا تھا۔ جس کی وجہ سے کسی شخص کی مجال مزار پر جانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقدوس مزار پر حاضر ہوئے، تو حضرت کی درخواست پر وہ چمک موقوف ہوئی۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا۔ ص ۱۸۲)

غرض اس طرح کے واقعات بھی لاتعداد ہیں، جن میں سے چند ایک کی تفصیل ہم " اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام " کے تحت پیش کر چکے ہیں اور پیران پیر تو جانوروں کو بھی اس نگاہِ جلالیت سے معاف نہیں فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک چیل کو مار دیا۔ دوسری دفعہ ایک چوہے کو، تیسری دفعہ ایک چڑیا کو۔ واقعات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اب خدائی کا ایک کارنامہ باقی رہ جاتا ہے، وہ ہے اخروی نجات ۔ اس بارے میں اولیاء اللہ، خدا سے بہت زیادہ فیاض ثابت ہوئے ہیں۔

بیعت ہی اُخروی نجات کی ضمانت ہے

" پھر شیخ الاسلام (خواجہ فرید الدین) نے فرمایا کہ (ان کے دادا پیر) شیخ معین الدین حسن سنجری (چشتی اجمیری) قدس سرہٗ العزیز کی یہ رسم تھی کہ جو کوئی ہمسایہ میں سے اس دنیا سے نقل (انتقال) کرتا اس کے جنازے کے ساتھ جاتے اور خلق کے لوٹ جانے کے بعد اس کی قبر پر بیٹھتے اور جو درود کہ ایسے وقت میں پڑھنے آئے ہیں پڑھتے۔ پھر وہاں سے آتے۔ چنانچہ اجمیر میں آپ کے ہمسایوں میں سے ایک نے انتقال کیا۔ دستور کے مطابق آپ جنازہ کے ساتھ گئے، جب اسے دفن کر چکے، خلق لوٹ آئی اور خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد آپ اُٹھے۔ شیخ الاسلام قطب الدین فرماتے ہیں کہ مَیں آپ کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ دمبدم آپ کا رنگ متغیّر ہوا، پھر اسی وقت برقرار ہو گیا۔ جب آپ وہاں سے کھڑے ہوئے، تو فرمایا" الحمد للہ بیعت بڑی اچھی چیز ہے۔"

شیخ الاسلام قطب الدین اوشی نے آپ سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "جب لوگ اس کو دفن کر کے چلے گئے، تو میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عذاب کے فرشتے آئے اور چاہا کہ اس کو عذاب کریں۔ اسی

وقت پر شیخ عثمان ہارونی (آپ کے پیر صاحب، م ۶۰۳۴ھ) قدس سرہ العزیز حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص میرے مریدوں میں سے ہے۔ جب خواجہ عثمان نے یہ کہا، تو فرشتوں کو فرمان ہوا کہ کہو" یہ تمہارے برخلاف تھا" خواجہ نے فرمایا" بیشک، اگرچہ برخلاف تھا مگر چونکہ اس نے اپنے آپ کو اس فقیر کے پلّے باندھا تھا، تو میں نہیں چاہتا کہ اس پر عذاب کیا جائے۔" فرمان ہوا "اے فرشتو! شیخ کے مرید سے ہاتھ اٹھاؤ، میں نے اس کو بخش دیا" پھر شیخ الاسلام آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمانے لگے کہ اپنے آپ کو کسی کے پلّے باندھنا بہت ہی اچھی چیز ہے"

(راحۃ القلوب، ملفوظات خواجہ فریدالدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی، مترجم غلام احمد بریاں، مطبع مجتبائی دہلی ص۱۴)

کسی فقیر کے پلّے باندھنے کے فوائد

اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱۔ ان بزرگوں کے کمالات کے مظاہرہ کے لئے قبر ایک ضروری چیز ہے اور کشفِ قبور کے لئے درود بھی مخصوص قسم کے ہوتے ہیں۔

۲۔ ان کے تصرف کا دائرہ دنیا کے علاوہ برزخ اور قیامت تک وسیع ہوتا ہے۔

۳۔ ان کی غیب دانی خدا کی طرح ہے اور فوراً مرید کی مصیبت کے مقام پر پہنچ جانا فرشتوں کی مانند ہوتا ہے۔

۴۔ خدا نے جزاء وسزا کا جو اٹل قانون مقرر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ کُلُّ نَفۡسٍ بِمَا کَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ وہ ان بزرگوں کی خواہش پر ہی غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔

۵۔ ان بزرگوں میں اور خدا میں فرشتوں کی وساطت سے ہر وقت سوال جواب ہو سکتے ہیں۔ شریعت میں تو انبیاء ہی اس مرتبہ کے اہل ہوتے ہیں مگر صوفیوں کے دین میں پیر بھی کسی حیثیت سے کم نہیں ہوتے۔

۶۔ انبیاء تو قیامت کے دن شفاعت کریں گے، لیکن یہ حضرات دنیا میں ہی شفاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے کس خوب صورت انداز میں خدا کے بجائے اپنی خدائی تسلیم کرائی جا رہی ہے۔ بیعت کی آڑ میں کیا کچھ ذہن نشین کرایا جا رہا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں فرما رہے ہیں۔

لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ اَوۡ يُعَذِّبَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ	اے پیغمبر! اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں۔ یا خدا اُن کے حال پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے کہ یہ ظالم لوگ ہیں۔ (۳/۱۲۸)

شفاعت اولیاء اللہ

ہمارے یہ بزرگ شفاعت کے بھی بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو بھی شفاعت کرنے کی مجال نہیں۔ احادیث سے البتہ یہ ثابت

ہے کہ روزِ محشر حضورِ اکرم ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ اُن کے بعد دُوسرے نبی اور نیکوکار لوگ بھی شفاعت کریں گے۔ بشرطیکہ وہ اپنے محاسبہ میں کامیاب ہو چکے ہوں اور سوا ان لوگوں کے جنہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت مل گئی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا اپنا حشر کیسا ہوگا۔ پھر دوسروں کی ذمہ داری اپنے سر اٹھانا کہاں تک درست ہے؟ اب مندرجہ ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

ابوالحسن خرقانی قیامت کے دن نجات دہندہ

فرمایا: ”جو یہاں آتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ یہ جان لے کہ قیامت کے روز میں اس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک کہ یہاں آنے والے کو نجات نہ دلا لوں گا۔ اگر کوئی ایسا یقین نہیں رکھتا، تو اسے کہدو کہ یہاں مت آئے اور مجھے مت ملے۔“ (مقربانِ حق، ص ۱۴۰)

اور صُوفیائے نقشبند صفحہ ۱۱۶ پر یہ روایت درج کرنے کے بعد یہ الفاظ زیادہ بھی ہیں کہ ”ایسا شخص مجھے سلام بھی نہ کہے۔“

پیرانِ پیر سے توسّل کے فائدے

۱۔ سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۲۴۷ پر مذکور ہے کہ ”غوث پاک کا ارشاد ہے: ”جو مسلمان میرے مدرسہ کے کسی دروازہ سے بھی گزرے گا۔ قیامت کے اس کو عذاب میں تخفیف ہوگی۔“ (طبقات الکبریٰ، ص ۱۲۷، ج ۱۔ بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۱۔ قلائد الجواہر، ص ۱۵)

۲۔ ایک روز بغداد کا ایک آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا ”میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ مجھے کہتا تھا کہ میں عذابِ قبر میں مبتلا ہوں، تم شیخ عبدالقادر کو میرے لئے دُعا کرنے کو کہو۔ آپ نے فرمایا: ”تمہارا والد میرے مدرسہ کے دروازے سے کبھی گزرا تھا؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں!“ آپ سُن کر خاموش ہوگئے۔ دوسرے دن وہ آدمی پھر آیا اور کہنے لگا ”آج میں نے پھر والد کو خواب میں دیکھا وہ بہت خوش و خرم ہے اور سبز لباس زیبِ تن کئے ہے۔ عذاب اس سے دُور کر دیا گیا ہے اور مجھے کہا کہ تم ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہا کرو۔ آپ نے یہ سُن کر ارشاد فرمایا کہ ”بیشک میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ جو مسلمان میرے مدرسہ کے دروازہ سے گزرے گا، میں اس کے عذاب میں تخفیف کروں گا۔“ (بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۱۔ قلائد الجواہر، ص ۱۵۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۷۰۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۴)

اب دیکھئے! مسلمانوں کی اوّلین درس گاہ مسجدِ نبویؐ ہے جس کے معلّم حضورِ اکرم ﷺ خود تھے لیکن اس

مسجد کی فضیلت کے متعلق ہمیں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ اس کے دروازہ سے گزرنے پر عذاب میں تخفیف کا وعدہ کیا گیا ہو۔ لیکن پیران پیر سے اللہ نے بھی وعدہ فرمادیا ہے، پھر مسجد نبویؐ افضل ہوئی یا شیخ عبدالقادر کا مدرسہ نظامیہ؟

۳۔ "غوث پاک کے زمانہ میں ایک شخص بہت ہی گنہگار تھا، لیکن اسے غوث پاک سے محبت ضرور تھی۔ اس کے مرنے کے بعد جب منکر نکیر نے اس سے سوالات کئے، تو اس نے ہر سوال کا جواب "عبدالقادر" کہتے ہوئے دیا۔ منکر نکیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ "یہ بندہ اگرچہ فاسق ہے مگر عبدالقادر سے اسے محبت ہے۔ میں نے اسے بخش دیا اور عبدالقادر سے محبت اور حسنِ اعتقاد کے عوض اس کی قبر کو وسیع کردیا۔" (تفریح الخاطر، ص ۲۳، بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۱۴)

۴۔ بغداد شریف کے محلہ بابُ الازج کے قبرستان میں ایک قبر سے مُردہ کے چیخنے کی آواز سنائی دینے کے متعلق لوگوں نے غوث پاک کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا: "کیا اس قبر والے نے مجھ سے خرقہ پہنا ہے؟" لوگوں نے کہا "ہمیں علم نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا: "کیا اس نے کبھی میری مجلس میں حاضری دی؟" لوگوں نے کہا "ہمیں اس کا بھی علم نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا: "کبھی اس نے میرے پیچھے نماز پڑھی تھی؟" لوگوں نے کہا: "ہمیں اس کا بھی علم نہیں۔" پھر آپ نے فرمایا: "بھولا ہوا شخص خسارہ میں ہی رہتا ہے۔" پھر آپ نے مراقبہ کیا اور سر اٹھا کر فرمایا: "فرشتوں نے مجھے کہا ہے کہ "اس شخص نے آپ کی زیارت کی ہے اور آپ سے حسنِ ظن اور محبت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم کردیا ہے۔" اس کے بعد اس قبر سے کبھی آواز سنائی نہ دی۔" (قلائد الجواہر، ص ۲۵ بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۱۴)

دیکھا آپ نے پیرانِ پیر کی شفاعت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ جب اہلِ دنیا سے کوئی گواہی دستیاب نہ ہوئی تو فرشتوں نے آکر گواہی بھی دے دی اور مغفرت کی بشارت بھی سنادی۔

۵۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ: "مشائخ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے غوث پاک سے پوچھا: کہ "ایک شخص نے آپ کی بیعت تو نہیں کی مگر آپ کا ارادتمند ہے، تو کیا وہ شخص آپ کے مریدین میں شمار ہوگا اور اُن کی فضیلتوں میں شریک ہوگا یا نہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جس نے اپنے آپ کو میری طرف منسوب کیا۔ وہ میرے ارادت مندوں میں شامل ہوگیا۔ اگرچہ یہ طریقہ مکروہ ہے تاہم ایسا شخص میرے اصحاب اور مریدین میں سے ہے اور میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ "وہ میرے تمام اصحاب اہلِ مذہب، میرے طریقہ پر چلنے والوں اور میرے محبوں کو بہشت میں جگہ دے گا۔" (اخبار الاخیار فارسی، ص ۲۵۔

قلائد الجواہر، ص ۱۵۔ بہجۃ الاسرار، ص ۱۰۱۔ تحفہ قادریہ، ص ۳۸ بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۳۲)

۶۔ غوثِ اعظم نے فرمایا: "جو کوئی مصیبت میں مجھ سے فریاد کرے، میں اس کی مصیبت کو دور کر ڈالوں گا۔ اور جو کوئی میرے توسل سے حاجت مانگے گا اللہ اس کی حاجت پوری کر دے گا۔" (قلائد الجواہر، اخبار الاخیار وغیرہ بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۶۷)

۷۔ غوث الثقلین فرماتے ہیں کہ "قیامت تک میرے دوستوں، محبّوں اور مریدوں میں سے جو کوئی ٹھوکر کھائے گا، میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں گا۔" (قلائد الجواہر، ص ۱۷، بحوالہ ایضاً)

۸۔ "فرمایا: حق تعالیٰ نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دیا۔ میں نے اپنی حدِ نظر تک دیکھا اس میں میرے اصحاب اور مریدوں کے نام لکھے ہوئے تھے جو قیامت تک اپنی نسبتوں کو میری طرف منسوب کر کے اصلاح چاہیں گے۔ حکم ہوا۔ "میں نے ان سب کو تیری وجہ سے بخش دیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۶۴)

دیکھا آپ نے، ادھر اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ میں اتنا لمبا چوڑا کاغذ تھماتا ہے اور ابھی اسے ملاحظہ فرما ہی رہے ہوتے ہیں ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مغفرت کا اعلانِ عام ہو جاتا ہے۔ اسے ہی کہتے ہیں جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔

۹۔ غوثِ اعظم نے فرمایا "مجھے اللہ کی عزت و جلالت کی قسم! کہ میرا ہاتھ اپنے مریدوں میں اس طرح ہے جس طرح آسمان (کا سایہ) ہے۔ اگر میرے مرید عالی مرتبہ نہ ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں، میں تو اللہ کی بارگاہ میں عالی مرتبہ ہوں ؎

مُرِیْدِیْ هِمْ وَطِبْ وَاشْطَحْ وَغَنِّیْ ۔۔۔ وَافْعَلْ مَا تَشَاءُ فَالْاِسْمُ عَالِیْ

اے میرے مرید خوش ہو اور بیباک ہاتھ سے جو چاہے کر گزر۔ میرا نام جو بڑا ہے تیرے پاس ہے

مُرِیْدِیْ لَا تَخَفْ اَللّٰهُ رَبِّیْ ۔۔۔ عَطَانِیْ رِفْعَةً نِلْتُ الْمَنَالِیْ

اے میرے مرید تو مت ڈر۔ اللہ کریم میرا رب ہے۔ اس نے مجھے رفعت و بلندی عنایت فرمائی ہے اور میں اپنی امیدوں کو پہنچا ہوں

نَظَرْتُ اِلٰی بِلَادِ اللّٰهِ جَمْعًا ۔۔۔ کَخَرْدَلَةٍ عَلٰی حُکْمِ التِّصَالِ

خدا کے تمام شہر اور ملک میری نگاہ میں رائی کے دانہ کی طرح ہیں اور میرے حکمِ انصال میں ہیں۔

وَوَلَّانِیْ عَلَی الْاَقْطَابِ جَمْعًا ۔۔۔ فَحُکْمِیْ نَافِذٌ فِیْ کُلِّ حَالِ

اللہ تعالیٰ نے مجھے جملہ اقطاب کا مختار بنایا ہے۔ پس میرا حکم ہر حال میں نافذ ہے۔

وَمَا مِنْهَا شُهُوْرٌ اَوْ دُهُوْرٌ ۔۔۔ تَمُرُّ وَتَنْقَضِیْ اِلَّا اَتَالِیْ

اور کوئی مہینہ اور سال ایسا نہیں ہے جو اپنے ظہور سے پہلے میرے پاس نہ آئے۔ (سیرتِ غوث، ص ۳۴)

۱۰۔ نیز آپ نے فرمایا کہ "ہم میں کا ایک انڈہ ہزار میں اور چوزہ کی قیمت تو لگائی نہیں جاسکتی۔ نیز فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک لکھا ہوا دفتر دیا۔ جس میں قیامت تک آنے والے میرے احباب اور مریدوں کے نام درج تھے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سب کو تیری وجہ سے میں نے بخش دیا" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۹۴)

۱۱۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے داروغۂ جہنم سے، جن کا نام مالک ہے، دریافت کیا کہ "میرے مریدوں میں سے تمہارے پاس کوئی ہے؟" جواب دیا "عزتِ پروردگار کی قسم! کوئی بھی نہیں"۔ "دیکھو! میرا دستِ حمایت میرے مریدوں پر ایسا ہے، جیسے آسمان زمین کے اوپر۔ اگر میرا مرید اچھا نہیں، تو کیا ہوا میں تو اچھا ہوں۔ جلالِ پروردگار کی قسم! جب تک میرے تمام مرید بہشت میں نہیں چلے جائیں گے، میں بارگاہِ خداوندی میں نہیں جاؤں گا۔ اگر مشرق میں میرے ایک مرید کا پردۂ عفت گر رہا ہو اور میں مغرب میں ہوں تو یقیناً میں اس کی پردہ پوشی[1] کروں گا"

(اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی، ترجمہ مولانا سبحان محمود صاحب، ص ۴۹)

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ حضورِ اکرم ﷺ نے تو اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا تھا کہ "آخرت میں تمہارے کام نہ آسکوں گا"[2] لیکن آپ کا سب مریدوں کی بخشش کے لئے اعلانِ عام ہے، تو اس روایت کے مطابق آپ عالی مرتبہ ہوتے یا حضورِ اکرم ﷺ؟

۲۔ آپ چونکہ اپنے بدکار مریدوں کی بخشش کا بھی ذمہ لے رہے ہیں، اس لئے کہ آپ خود تو اچھے ہیں، تو اس طرح تو اللہ تعالیٰ کا قانون غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر خدائی آپ کی ہوئی یا اللہ کی، مالکِ یوم الدین کون ہوا؟

۳۔ خدا کے وعدہ مغفرت پر آپ کو اطمینان نہ ہوا، تو آپ نے باقاعدہ جہنم کے داروغہ مالک سے ملاقات کر کے تصدیق و توثیق کرلی بعدازاں مریدوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا۔

۴۔ آپ کا مریدوں پر تصرف اتنا ہمہ گیر اور محیط ہے جیسے آسمان زمین کو محیط ہے اور غیب دانی کا یہ عالم کہ

---

[1] ان واقعات کی صحت کی ذمہ داری تذکرہ نگاروں پر ہے

[2] حضورِ اکرم ﷺ نے تو اپنی پیاری بیٹی سیدۃ النساء سے فرمایا تھا کہ

یا فاطمۃ انقذی نفسک من النار — فاطمہ! اپنی جان کو آگ سے تو خود بچا (بخاری کتاب التفسیر سورۃ شعراء)

اور پھر ایک دفعہ یوں بھی فرمایا تھا کہ "اے فاطمہ! مجھ سے جو مانگنا ہے اسی دنیا میں مانگ لے، قیامت کے دن میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔" (بخاری) اور ان حضرات کے یہ دعوے ساء ما یحکمون

مشرق میں کسی مرید کو کچھ تکلیف پہنچ رہی ہو اور آپ مغرب میں ہوں تو بھی دستگیری کرنے کے لئے جائے واردات پر فوراً پہنچ جاتے ہیں۔

اب بتلائیے کہ اگر مریدوں کو آپ کے سلسلہ میں محض منسلک ہو جانے سے اتنے فوائد حاصل ہو جائیں تو شرعی تکلیفات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے ادا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ آپکے نام کی نذر گیارھویں دے دی جائے اور آپ کو بوقتِ ضرورت پکار لیا جائے تاکہ آپکے معتقدین کے زُمرہ میں شامل ہو کر آخرت میں نجات حاصل کی جا سکے۔؟

یہ مزارات اور خانقاہیں

قبر پرستی اور بُت پرستی میں قدرِ مشترک

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ قومِ نوح میں بُت پرستی سے پہلے قبروں پر اعتکاف اور مراقبہ کرنے کا رواج ہوا تھا۔ بعد میں انہی اولیاء اللہ کے مجسمے بنا لئے گئے اور ان کی پُوجا شروع ہو گئی۔ ان دونوں قسم کی پرستشوں میں قدرِ مشترک یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح مرنے کے بعد قبر کے ساتھ صاحبِ قبر کی رُوح کا تعلق باقی رہتا ہے اور وہ رُوح پکارنے والے کی پکار سنتی اور اس کی حاجت روائی کرتی ہے بعینہٖ اسی طرح اس "ولی" کا اگر مجسمہ بنا لیا جائے تو اس سے بھی وہی فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی قبروں پر جانے کے بجائے انہوں نے شارٹ کٹ یہ سوچا کہ ان کے بُت بنا لئے جائیں جنہیں وہ جہاں چاہتے رکھ سکتے اور ان کی پُوجا پاٹ کر سکتے اور ان سے اپنی مرادیں پوری کرا سکتے تھے۔ اسی سہولت کی خاطر بُت تراشی کا فن ایجاد ہوا، جو ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لوگ اپنے ان "بنے بنائے خداؤں" کو خرید لیتے اور جہاں چاہتے لے جاتے۔ چنانچہ عرب میں پہلا شخص جو بُت لایا وہ قصی بن کلاب تھا۔

قبروں سے متعلق بعینہٖ یہی تصور آج مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یہی تصور درحقیقت "ولایت یا اولیائی" کی روحِ رواں ہے۔ چونکہ اپنے بزرگوں سے عقیدت انسان کی فطرت میں رچی ہوئی ہے لہٰذا یہی شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ ثابت ہوا ہے۔ یہاں چند ایک سوالات خود بخود ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ کیا واقعی قبر کے ساتھ صاحبِ قبر کی رُوح کا تعلق ہوتا ہے، جو اس کی پکار سن کر اس کی حاجت روائی کرتی ہے؟

۲۔ اور اگر کرتی ہے، تو کیسے؟

۳۔ کیا جو کچھ قبروں پر ہوتا ہے اس کے متعلق شریعت خاموش ہے یا کچھ واضح احکام موجود ہیں؟

ہم مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر ان تینوں باتوں پر تفصیل سے بات کریں گے۔

کیا فوت شدہ لوگ سن سکتے ہیں؟

اس سوال کو شرعی اصطلاح میں "سماعِ موتیٰ" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم کے واضح ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱-۲۰)

اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۗءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۳۵/۲۲-۲۱)

اور نہ ہی زندے اور مُردے برابر ہو سکتے ہیں۔ خدا جس کو چاہتا ہے سُنا دیتا ہے اور تم ان کو جو قبروں میں (مدفون) ہیں سنا نہیں سکتے۔

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (۴۶/۶-۵)

اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے، جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے اور اُن کو اُن کے پکارنے کی خبر ہی نہ ہو اور جب لوگ (قیامت کو) اکٹھے کئے جائیں گے، تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے انکار کریں گے۔

یہ اور اسی طرح قرآن کریم میں اور بھی کئی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردے سُن نہیں سکتے، لیکن سماعِ موتیٰ کے قائلین ہر آیت کی کوئی نہ کوئی ایسی تاویل و توجیہہ پیش کر دیتے ہیں جن سے کم از کم فوت شدہ بزرگانِ کرام کے سننے کا استثنا ہو سکے۔ لہٰذا ان آیات کا ہم ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

یہ تو واضح ہے کہ عبادت یا تو بتوں کی ہوتی رہی ہے یا سورج چاند، ہوا، پانی، درخت وغیرہ یا فوت شدہ بزرگوں کی یا جنوں اور فرشتوں کی۔ اب دیکھئے آیت نمبر ا میں جنوں اور فرشتوں پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ دونوں غیر مرئی مخلوق ہیں اور ان کے مرنے جینے کو ہم معلوم نہیں کر سکتے اور بتوں

یا دیگر مظاہر پر بعث بعد الموت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وَمَا یَشْعُرُونَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ کے الفاظ بھی ان کو خارج از بحث قرار دے رہے ہیں۔ لہٰذا لامحالہ اس آیت سے صرف فوت شدہ بزرگ ہی مُراد لئے جا سکتے ہیں۔ اس توجیہہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مشرکین مکہ تو بُت پرست تھے وہ قبر پرست تو نہیں تھے۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ کی قبر پرستی تو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ پھر احادیث و آثار سے یہ بھی ثابت ہے کہ جن بتوں کی پرستش ہوتی تھی تو وہ اُنہی بزرگان کرام کے مجسمے تھے، جن کی پہلے قبریں پوجی جاتی تھیں۔ جیسے ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔

آیت نمبر ۲ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں اموات سے مراد، مُردہ ضمیر کافر ہیں اور من فی القبور سے مراد گمراہی میں پڑے لوگ۔ گو یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن کوئی قرینہ ایسا نہیں کہ اس سے مراد فوت شدہ بزرگ نہ لئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اصل معانی وہی ہیں جو بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں اموات سے مراد کفار بھی لئے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہی وہ آیت ہے جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سماع موتیٰ کے انکار پر استدلال فرمایا تھا۔

مزید غور فرمائیے آیت نمبر ۳ میں عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودان باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کی موت و زیست کا ہمیں علم نہیں اور بحالت زیست وہ دُعا سن سکتے ہیں اور كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً کے الفاظ بتوں اور مظاہر کو اس زمرہ سے نکال دیتے ہیں۔ کیونکہ ان بے جان اشیاء کی نہ دنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ نہ آخرت میں دشمنی کا کچھ نقصان بلکہ ان میں اکثر چیزوں کا تو اس وقت وجود تک بھی نہ ہو گا۔ باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں، جو اس آیت کا مصداق بن سکتے ہیں۔

احادیث اور سماع موتیٰ

اب احادیث کی طرف آیئے۔ سماع موتیٰ کے حق میں سب سے بڑی دلیل بدر کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے، جو بخاری میں بالتفصیل کتاب المغازی میں مذکور ہے۔ چوبیس کافروں کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک دی گئی تھیں۔ ان سب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب کر کے اور نام بمعہ والد (اے فلاں ابن فلاں) لے لے کر پکارا اور کہا کہ "ہم سے تو اللہ نے وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا، کیا تم سے اللہ کا وعدہ پورا ہوا؟" تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا "یا رسول اللہ! یہ تو مُردے ہیں۔" تو آپ نے فرمایا: "کہ تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔"

اب حضرت قتادہ رحمہ اللہ اسے ایک استثنائی صورت (یعنی اللہ کا اسماع ہے) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خدا نے اس خاص وقت میں ان کو زندہ کر دیا تھا اور حضرت عائشہ ؓ یوں فرماتی ہیں کہ وہ جس حالت میں بھی تھے، خُدا نے ان کو معلوم کرا دیا تھا اور پھر یہ آیت پڑھی ان اللہ یسمع من یشاء و ما انت بمسمع من فی القبور۔

تاہم بعض صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر ؓ اور کچھ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف تھا مگر وہ بھی مُردوں کے سننے کی حد تک۔ سُن کر جواب دینے یا جوابی کارروائی کرنے کا کوئی بھی قائل نہ تھا (ملاحظہ ہو تیسیر الباری، حاشیہ متعلقہ حدیث مندرجہ) سماع سے متعلق اختلاف کی اصل وجہ در اصل چند دوسری احادیث تھیں، مثلاً :

۱۔ جب ہم قبرستان جاتے ہیں، تو ہمیں السلام علیکم یا اھل القبور .... الخ پڑھنے کا حکم ہے۔ پھر اگر مُردے سنتے ہی نہیں، تو اس طرزِ تخاطب کے کیا معنی ؟

۲۔ احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ مُردے کو جب دفن کر کے واپس آتے ہیں تو وہ واپس لوٹنے والوں کی جوتیوں کی چاپ سنتا ہے۔

حدیث نمبر ۱ کی مندرجہ آیات سے تطبیق یوں ہوتی ہے کہ یہ سلام، سلام دُعا ہے۔ سلام تحیہ نہیں۔ سلام تحیہ وہ ہوتا ہے جن کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

بموجب ارشاد باری تعالیٰ :

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (۴/۸۵) — اور جب تم کو کوئی دعا دے تو جواب میں (اس سے بہتر دُعا دو یا انہی لفظوں سے دُعا دو۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم ایک دوسرے سے ملو تو ایک السلام علیکم کہے اور دوسرا اسے وعلیکم السلام سے جواب دے۔ اور یہ جواب دینا فرض ہے۔

دوسری قسم سلام دعا ہے۔ اس کا جواب دینا تو درکنار سننا بھی مخاطب کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے ہم کسی کو خط لکھتے ہیں تو ابتداء اسے مخاطب کر کے السلام علیکم لکھتے ہیں۔ پھر کبھی اس کا جواب آجاتا ہے کبھی نہیں بھی آتا۔ اس کی دوسری مثال وہ سلام ہے جو ہم نماز میں حضور اکرم ﷺ پر اپنے آپ پر اور تمام نیک بندوں پر پڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے حضور اکرم ﷺ یا دوسرے نیک بندوں میں سے کوئی بھی نہ یہ سلام سنتا تھا نہ اس سلام کا جواب دیتا تھا۔ کیونکہ سُن لینے کے بعد اس کا جواب دینا فرض ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں بھی یا ایُّھا النبی میں "یا"

کا لفظ "ندا" کے طور پر نہیں۔ بلکہ نماز کے اذکار جو آنحضرت ﷺ سے ماثور ہیں۔ وہ اسی طرح اور اسی ترتیب سے بطورِ حکایت پڑھے جاتے ہیں۔ بالکل یہی صورت "السلام علیکم یا اھل القبور....." کی بھی ہے۔

حدیث نمبر ۲ میں جو مُردے کا جانے والوں کی جوتیوں کی چاپ سننے کا ذکر ہے۔ تو یہ محض اسے حسرت دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ سنا دیتے ہیں۔ جس طرح قلیبِ بدر کے کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سنا دیا تھا۔ اس حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ وہ ان قبر پر آنے والوں کی بھی چاپ سنتا ہے یا ان کی دوسری باتیں بھی سنتا ہے۔ صرف رخصت کر کے جانے والوں کی جوتیوں کی چاپ کا ذکر ہے کہ لو جن عزیزوں کے لئے تم نے اپنی زندگی کا بیشتر اور عزیز ترین حصہ صرف کر دیا اور حلال و حرام تک بھی تمیز نہ رکھی وہ سب چھوڑ کر واپس جا رہے ہیں۔ منکر نکیر کا سوال و جواب ایک استثنائی اور اضطراری امر ہے۔ لہٰذا اس اضطرار سے علی الاطلاق سماعِ موتیٰ کا امکان درست نہیں کہ یہ بھی استثنائی صورت ہے۔

مندرجہ آیت نمبر ۳ کے ضمن میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سماعِ موتیٰ سے متعلق جو حاشیہ لکھا ہے۔ وہ اس مسئلہ سے متعلق بیشتر اشکال کو دُور کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کو یہاں درج کرنا مناسب رہے گا۔ (سورہ احقاف ۴۶، آیت نمبر ۵، ۶ کا حاشیہ از تفہیم القرآن، جلد ۴)

"یعنی ان تک ان پکارنے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے اس کو سنتے ہیں نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں انہیں کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشادِ الٰہی کو تفصیلاً یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں وہ تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک بے رُوح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ جو گزر چکے۔ تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بھی بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی بگاڑ کر دُنیا سے رخصت ہوئے۔ پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دُعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہے ہی۔ رہے دوسری قسم کے معبُود، جو اللہ کے مقرب انسان تھے، تو اُن کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہِ راست ان تک نہیں پہنچتیں دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو یہ بزرگ ساری عمر اللہ سے دُعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب الٹی آپ (اس بزرگ) سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے بے خبر رہنے کی بھی دو

ہی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملزموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں حوالات میں بند ہیں۔ جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی انہیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ یہ خبریں ان کیلئے مسرت کی موجب ہوں گی اور خدا ظالموں کو ہرگز خوش کرنا نہیں چاہتا۔"

"اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دعائے رحمت (جیسے قبر پر یا نماز میں) پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کے لئے فرحت کی موجب ہیں اور اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکار اور زجر و توبیخ سے مطلع فرما دیتا ہے۔ جیسے جنگِ بدر میں مارے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ کی توبیخ سنوا دی گئی۔ کیونکہ ان کے لئے یہ اذیت کی موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لئے رنج کی موجب یا مجرمین کے لئے فرحت کی موجب ہو وہ ان تک نہیں پہنچائی جاتی۔ اس تشریح سے سماع موتیٰ کے مسئلے کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔"

مُردوں کی برزخی زندگی

دراصل سماع موتیٰ کی بحث سے پہلے ایک اور بحث بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مُردے سُن تو تب ہی سکتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوں۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا مُردے زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر زندہ ہیں تو کس طرح کی زندگی ہے؟ تو اس کے متعلق قرآن و حدیث میں واضح ارشادات موجود ہیں کہ رُوح کو چاروں مراحل[1] موت و زیست میں فنا نہیں۔ وہ جب سے پیدا ہوئی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو کہاں رہتی ہیں، تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ کافروں کی رُوحیں "سجین" اور مومنوں کی "علیین" میں۔ یہ مقام کہاں واقع ہیں؟ یہ جاننے کے نہ ہم مکلف ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ برزخی زندگی کا معاملہ ہے۔ البتہ شہیدوں کی رُوحوں کے بارے میں تخصیص ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴)

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم سمجھ نہیں سکتے۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مُردہ مت سمجھو وہ

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے میری تصنیف روح، عذاب قبر اور سماع موتی ملاحظہ فرمائیے۔

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۳/۱۶۹) زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پا رہے ہیں۔

گویا شہداء کی زندگی عام لوگوں سے مختلف اور بہتر تو ہے لیکن سمجھ ہم وہ بھی نہیں سکتے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص بہشت میں جاتا ہے وہ پھر دنیا میں آنا پسند نہیں کرتا۔ گو اس کو ساری زمین کی دولت ملے البتہ شہید دنیا میں آنے کی اور دس بار اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کرتا ہے کیونکہ وہ شہادت کی عزت وہاں دیکھتا ہے۔" (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب تمنی المجاہد ان یرجع الی الدنیا)

ان ارشادات سے واضح ہو گیا کہ کوئی نیک آدمی جو بہشت میں جاتا ہے۔ اس کی رُوح دنیا میں واپس نہیں آسکتی کیونکہ یہ اللہ کے دستور کے خلاف ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ اللہ کی سنت یا دستور کیا ہے؟ اور شہداء کی تکریم کی وجہ کیا ہے؟

انسان کی رُوح کا سفر کچھ اس طرح ہے کہ وہ بطنِ مادر میں داخل ہونے سے مدتوں پہلے پیدا ہو چکی تھی پھر اپنے وقت پر جنین میں داخل ہوتی ہے۔ پھر بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد روح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے۔ قیامت تک وہاں رہے گی۔ پھر سفرِ آخرت ہے۔ نیک روحیں جنت میں چلی جائیں گی اور بد روحیں جہنم میں۔ یا اللہ تعالیٰ اِن جہنمیوں میں سے بھی بعض کو بعد میں جنت میں داخل کر دیں گے بس یہاں پہنچ کر یہ سفر ختم ہو جاتا ہے۔

اب اس سفر کی ترتیب بدل نہیں سکتی، لیکن اس میں شارٹ کٹ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بچہ جوان یا بوڑھا ہونے سے پیشتر ہی مر جائے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بوڑھا بچہ بن جائے۔ شہداء کی تکریم اور تحسین یہ ہے کہ انہیں مرنے کے بعد برزخ میں نہیں رکھا جاتا بلکہ براہ راست انہیں جنت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چہچہاتی پھرتی ہیں۔

کیا رُوح کا اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہے؟

اب یہ تو ظاہر ہے کہ برزخ یا بہشت میں رہنے والی رُوحیں اس دنیا کے لوگوں کی پکار یا دُعا یا بات سن ہی نہیں سکتیں۔ اللہ تعالےٰ پہنچا دے تو الگ بات ہے۔ بدکار لوگوں کی روحیں ویسے ہی مقید ہیں۔ انہیں یہاں آنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے اور نیک لوگوں کی روحیں کسی قیمت پر اس دنیا میں آنے کا نام نہ لیں گی۔ البتہ شہیدوں

کی رُوحیں آنے کی آرزو کریں گی۔ وہ بھی اس لئے نہیں کہ اپنے اہل و عیال یا متعلقین کی صورتِ حال سے مطلع کریں اور ان کی حاجت روائی یا مشکل کشائی یا بشارات سنائیں بلکہ اس لیئے کہ بار بار شہید ہو کر ان کا درجہ او زیادہ بلند ہو جو ان کو پہلی مرتبہ شہید ہونے پر ملا۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بدکاروں اور عام مسلمانوں کی رُوحیں تو عالمِ برزخ (سجین اور علیین) میں ہوئیں اور شہیدوں، نبیوں اور صدیقوں وغیرہ کی جنت ہیں۔ جو دنیا سے بہت دُور اور سفر کی آخری منزل ہے۔ پھر بھلا وہ رُوحیں اس دنیا میں کیوں آئیں گی ؟

اِن تصریحات سے صاف واضح ہو گیا کہ قبر میں یا اُس کے آس پاس یا اس دنیا میں کسی فوت شدہ انسان کی رُوح نہیں ہوتی۔ لہٰذا اسماعِ موتیٰ کی بحث ہی سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ رہا درود و سلام کو مسئلہ تو اس کی وضاحت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اور اسی تصریح کی تائید احادیث بھی کرتی ہیں۔

اولیاء اللہ مرتے نہیں

لیکن ہمارے صوفیاء بضد ہیں کہ ولی زندہ ہوتے ہیں اور اُنہوں نے ایک حدیث یا مقولہ بھی بنایا ہوا ہے کہ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا یَمُوْتُوْنَ یعنی ولی مرتے نہیں۔ ان پر بس اک لمحہ کے لئے موت آتی ہے۔ پھر زندہ ہو جاتے ہیں[1]۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا جسدِ مبارک آپ کی وفات سے ۳۲ گھنٹے بعد دفن کیا گیا۔ تو کیا اس وقت وہ زندہ تھے ؟ اور اگر زندہ تھے تو وہ صحابہ کی باتیں سنتے تھے ؟ اور اگر سُن سکتے تھے، تو پھر بولتے کیوں نہ تھے۔ نیز یہ کہ اگر زندہ تھے تو انہیں دفن کیوں کیا گیا ؟ اگر ان صوفیاء کے عقیدہ کو صحیح سمجھ لیا جائے، تو ایسے لاتعداد سوال اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی جواب نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ پیری فقیری کے کاروبار کا سب سے بڑا چور دروازہ یہی سماعِ موتیٰ کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مُردوں کے سننے کی پُرزور تردید کی اور اس کی تمام امکانی شکلوں کا دروازہ بند کر دیا۔ حدیث میں اگر مُردوں کے سننے کے متعلق کچھ اشارات ملتے ہیں، تو بعینہٖ ان کے بولنے کے متعلق بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ کسی نیک آدمی کی میت یہ کہتی ہے کہ قَدِّمُوْنِیْ

---

[1] حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اپنے مُرشد میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھے۔ آپ فرماتے ہیں :

"مرض الموت میں جب آپ نے یہ کلمات کہے کہ پیامِ سفرِ آخرت آگیا ہے، تو میں پالکی کی پٹی پکڑ کر رونے لگا۔ حضرت نے تسلی دی اور فرمایا کہ " فقیر مرتا نہیں بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں انتقال کرتا ہے۔ فقیر کی قبر سے وہی فائدہ ہوگا جو ظاہری زندگی میں ہوتا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت۔ مولانا زکریا، ص ۲۳۴)

قَدِّمُوْنِیْ " مجھے جلدی لے چلو، جلدی لے چلو (یعنی جلدی جاکر قبر میں دفن کرو) اسی طرح بدکار آدمی کی میت کہتی ہے کہ "ہائے مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اب بتائیے کیا آپ نے کسی میت کی یہ آواز سنی ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم مُردوں کے بولنے یا سننے کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ وہ برزخی زندگی کا بولنا اور سننا ہے، تو جس طرح ہم برزخی زندگی میں مُردہ کی پکار اس دنیا میں سُن نہیں سکتے۔ اسی طرح مُردہ روحیں جو برزخی زندگی میں ہیں، ہماری پکار سُن نہیں سکتیں۔ اس کی تھوڑی بہت وضاحت خواب سے ہوسکتی ہے۔ سوتا آدمی جاگتے کی آواز نہیں سن سکتا۔ حالانکہ وہ زندہ ہوتا ہے اور خواب میں سونے والا آدمی جو کچھ باتیں دوسروں سے کرتا ہے۔ پاس بیٹھا جاگتا آدمی سن نہیں سکتا۔ بعینہٖ یہی مثال فوت شدہ آدمیوں کے بولنے اور سننے کی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ بزرگ حضرات اپنے کشف کے ذریعہ ان رُوحوں سے ملاقات کرتے اور ان سے سوال و جواب کرسکتے ہیں، اپنی سنا سکتے ہیں، ان کی سُن سکتے ہیں۔ لیکن یہ سماع موتیٰ کا مسئلہ تو عوام سے متعلق ہے جو قبروں پر جاکر نذریں نیازیں چڑھاتے ہیں۔ پھر جس طرح صوفیا اور علمائے شریعت میں سماع موتیٰ کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے، کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ مُردوں کے بولنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہو؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے اگر وہ زندہ ہیں تو انہیں بولنا بھی چاہیئے۔ آپ اس مسئلہ پر جتنا غور کریں گے یہی حقیقت سامنے آئے گی کہ اس مسئلہ کی تہہ میں "دنیوی مال اور عزّہ وجاہ کی طلب" ہی کارفرما ہیں - اور انہی دو باتوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

"دو بھوکے بھیڑئیے اگر بکریوں کے ریوڑ میں جا پڑیں تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا انسان کے دین کو مال اور شرف کی طلب خراب کرتے ہیں" (ترمذی) ان تصریحات کے باوجود ہمارے صوفیاء نے صاحب قبر کی روح کو قبر میں موجود ہونے اور بیرونی معاملات سے پورا علم رکھنے کو اپنے ایمان کا جزو بنا دیا ہے۔ جیساکہ درج ذیل واقعہ سے ظاہر ہے:

"نقل ہے کہ ایک بار آپ (شبلیؒ) حضرت جنید کے مزار پر انوار پر کھڑے تھے۔ کسی نے ایک مسئلہ پوچھا: آپ نے جواب نہ دیا۔ اس نے عرض کیا "آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟" فرمایا: "صاحب قبر سے حیا آتی ہے۔ ان کے سامنے جواب کیسے دوں؟" پھر یہ شعر پڑھا:

انی لاستحییت فی التراب بیننا　　کما کنت استحییت وھو یراف

بلاشبہ میں ان کے قبر میں ہونے کے باوجود ایسے ہی حیا کرتا ہوں جیسے کہ میں زندگی میں کرتا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہے ہوتے تھے۔

صاحب قبر کی حاجت برآری

قرآن و حدیث سے یہ واضح ہے کہ صاحب قبر کی روح نہ اس دنیا میں واپس آتی ہے۔ نہ وہ کسی پکارنے والے کی پکار سنتی ہے، نہ اسے کچھ خبر ہوتی ہے اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اس کے جسم کو اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قبروں پر مراقبہ کرنے والوں کو بسا اوقات صاحب قبر کی روح ملتی ہے۔ اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور مکاشفات کا دارومدار ہی اسی بات پر ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اہل قبر سے مرادیں مانگنے والوں کی بعض اوقات مرادیں بھی پوری ہو جاتی ہیں، تو آخر یہ کیا معمہ ہے؟

پھر یہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں کہ قبر سے حاجت برآری ہوتی ہے بلکہ بتوں سے بھی ہو جاتی ہے بت بھی بسا اوقات اپنے پجاریوں کے سوالوں کے جواب دے کر انہیں مطمئن کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے باب میں "بتوں کی کرامات" کے تحت دو واقعات درج کر آئے ہیں۔ پھر یہ بات اتنی ہی نہیں۔ ایسی مرادیں درختوں، پتھروں، سورج، چاند، ستاروں، آگ وغیرہ کی پرستش کرنے سے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ ورنہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد انہیں کبھی نہ پوجتی۔ پھر یہ بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ آپ بغیر مُردہ کے ایک قبر تعمیر کر کے اس پر باقاعدہ غلاف وغیرہ چڑھا کر یا ایسے ہی کوئی لکڑی یا مرا ہوا جانور دفن کر کے اس پر قبر تعمیر کر دیں اور مجاور بن کر بیٹھ جائیں تو مرادیں وہاں سے بھی پوری ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اور بعض دفعہ آپ کو آپ کی دعا و پکار کا جواب بھی مل جائے گا۔

ایک بزرگ سات قبریں اور حاجت روائیاں

سیرت خواجہ اویس قرنی کا تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ خواجہ اویس کہاں فوت ہوئے اور کہاں دفن ہوئے، اس میں اختلاف ہے۔ سات مقامات کا نام لیا جاتا ہے اور سات جگہ ہی آپ کا مزار ہے اور یہ ساتوں مرجع خاص و عام ہیں۔" (الاویس، ص ۸۶-۸۵، اویسیہ پبلشرز لاہور)

اب اس گھر کی شہادت کے بعد بھی کچھ شبہ رہ جاتا ہے کہ مراقبہ کی صورت میں صاحب قبر کی روح سے سوال و جواب نہیں ہوتے بلکہ وہ کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے، جو آستانوں، قبروں، بتوں، درختوں اور پتھروں

سے جواب دیتی اور بزعم خود ان کی بعض مرادیں پوری کرتی ہے۔ شعرانی کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر ولی کی قبر پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا ہے، جو اس ولی سے مانگی گئی حاجتیں پوری کرتا ہے۔" (غایۃ الامانی، ص ۱۴۱)

لیکن یہ حاجت برآری کا مسئلہ اگر صرف قبروں تک محدود ہوتا تو شاید یہ بات بلاسند بھی تسلیم کر لی جاتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ حاجت برآری کا مسئلہ تمام مذکورہ اشیاء میں یکساں پایا جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان چلہ کشی، ریاضتوں اور بعض دوسرے فنون کے ذریعہ غیر مرئی مخلوق کو دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس غیر مرئی مخلوق یا عالم ارواح میں بھی کئی طرح کی مخلوق پائی جاتی ہے۔ ان میں فرشتے بھی پائے جاتے ہیں، جنات بھی، شیطان کے لشکر بھی اور بقول ان لوگوں کے فوت شدہ انسانوں کی روحیں بھی۔ انسانوں کی فوت شدہ روحوں کے متعلق وضاحت ہو چکی کہ وہ دنیا میں نہیں آسکتیں۔ فرشتے پہلے ہی مامور من اللہ ہوتے ہیں، جیسے چاند سورج وغیرہ ہیں۔ ان کی عبادت بھی انہی چیزوں کی طرح اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے۔ باقی جن اور شیطان ہی رہ جاتے ہیں۔ جن بھی گو انسان کی طرح شرعاً مکلف ہیں۔ مگر ان میں سے بھی انسانوں کی طرح بیشتر طبقہ گمراہ ہی رہا ہے۔ اور یہ شیطان اور جن ہر طرح کی شکل اور ہر ایک کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ حضور اکرم ﷺ کی شکل نہیں دھار سکتے، تاہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ کسی اور بزرگ کی شکل دھار کر مراقبہ کرنے والے سے یہ کہہ دیں کہ میں ہی حضور اکرم ﷺ ہوں۔ ابلیس کو خدا نے وسوسہ کا تصرف بھی دیا ہے اور اس نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ "اے خدا! میں تیرے اکثر بندوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔" وہ انسانوں سے زیادہ عیار اور ہوشیار ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں عنوان "دیدار الٰہی اور شیطانی فریب" کے تحت ایک واقعہ نقل کر آئے ہیں، جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اپنا نقل کردہ ہے کہ شیطان نے انہیں بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اللہ کی مہربانی سے بچ گئے۔ اس وقت شیطان نے کہا کہ میں تمہارے جیسے ستر زاہدوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔ اسی ایک واقعہ سے شیطان کی کارستانیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پیران پیر اور شیطانی فریب

محولہ بالا واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے دوبارہ یہاں نقل کر رہے ہیں:

"ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے۔ اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی۔ اس نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے۔" میں نے کہا: "دور ہو مردود۔" یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت

سے بدل گئی اور وہ صورت دھواں بن گئی اور ایک آواز آئی کہ "عبدالقادر! تم کو تمہارے علم و تفقہ نے بچا لیا ورنہ اسی طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔" میں نے کہا: "محض اللہ کی مہربانی سے۔"

کسی نے عرض کیا کہ "حضرت! آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے؟" فرمایا: "اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔" (الطبقات الکبریٰ للشعرانی، ج ۱، ص ۱۳۰ و طبقات الحنابلہ ابن رجب بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۱، ص ۱۸۷، مصنفہ ابوالحسن علی ندوی)

اس واقعہ سے درج ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ شیطان بھی اپنے ظہور سے پہلے تجلی ڈال سکتا ہے۔ اکثر صوفیاء اس تجلی کو تجلی الٰہی یا مشاہدۂ حق سمجھ لیتے ہیں۔

۲۔ شیطان نمودار ہو کر رب ہونے کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے، تو اُسے کسی دوسری ہستی کے متعلق دعویٰ کرنا اس سے بہت آسان ہے۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی شکل اختیار تو نہیں کر سکتا، لیکن اور کی شکل بن کر یہ جھوٹ بول سکتا ہے کہ میں ہی محمد ﷺ ہوں یا آپؐ کی شکل میں جلوہ گری کرتا ہے، تو دیکھنے والا اس وجہ سے فریب میں آجاتا ہے کہ اُس نے آپ کو زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس دھوکہ سے صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔ اور صاحب قبر کی شکل اختیار کرنا تو اس کے لئے بہت ہی آسان ہے۔

۳۔ اس طرح شیطان سے جو سوال و جواب ہوتے ہیں۔ یہی باتیں مکاشفات کی اصل بنیاد ہے۔

۴۔ اکثر صوفیاء دانستہ دروغ گوئی نہ کرنے کے باوجود گمراہ ہوتے ہیں۔

۵۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اولیاء اللہ کی تاریخ میں عبدالقادر جیلانیؒ کے پائے کے کل کتنے ولی... ... ہو گزرے ہیں۔ جن میں سے ستر (۷۰) کو تو شیطان نے گمراہ کر دیا۔ باقی اولیاء الرحمٰن کتنے رہ گئے ہوں گے؟

انہی اُمور کے متعلق قرآن کریم کی درج ذیل آیت روشنی ڈالتی ہے:

اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِهِمْ	بے شک شیاطین اپنے ولیوں کے دلوں میں بات ڈالتے ہیں۔ (۶/۱۲۱)

اور جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ "خدا کی راہ میں بہت سے راہزن (شیطان) ہوتے ہیں جو طرح طرح کے جال پھیلاتے ہیں مثلاً: نور کا جال، لطف و کرم کا جال، کبر کا جال، مکر و فریب کا جال اور سب سے بڑھ کر استدراج کا جال جس میں شیطان فریب خوردہ کو ولی، نبی اور مسیح تک بنا دیتا ہے، لیکن مردِ حق وہ ہے جو نورِ حق اور نورِ

شیطان میں تفریق کرے اور اس وقت شیطان کے فریب میں آنے سے محفوظ رہے شیطان لعین نے ایسے ہی انوار و استدراج سے سیکڑوں عابدوں کو برباد کر دیا ہے۔" (مقربانِ حق، ص ۱۲۸)

اب اس شیطانی فریب کی مزید چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

۲۔ جنید بغدادی کا مرید اور بہشت کی سیر

شیخ جنیدؒ کے مریدوں میں سے ایک نے اہلِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر ویرانے میں ایک عبادت خانہ بنا کر رہنا شروع کیا۔ ہر رات ایک اونٹ لایا جاتا اور اس پر بٹھا کر اسے بہشت کی سیر کرائی جاتی اس چیز نے اس کے دماغ میں نخوت پیدا کر دی۔ رفتہ رفتہ شیخ جنیدؒ کو خبر پہنچی، تو آپ وہاں تشریف لے گئے اور سب احوال پوچھے۔ شیخ نے کہا کہ آج رات تُو جب بہشت میں پہنچے، تو تین بار لاحول پڑھنا۔ رات کو جب حسبِ معمول اسے انہی مقامات کی سیر کرائی گئی تو اس نے برائے امتحان لاحول پڑھا۔ شیاطین، جو اس کام کے مؤکل تھے، فرار ہو گئے اور وہ تنہا رہ گیا اور اپنے آپ کو ایسی گندگی کے ڈھیر پر پایا جس کی عفونت سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ آس پاس مُردار جانوروں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ اپنی غلطی پر آگاہ ہو کر بے حد پشیمان ہوا۔ توبہ کی اور دوبارہ شیخ کی خدمت میں رہنے لگا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۱)

۳۔ مُردہ زندہ کرنے والا جنات کا عامل

"نقل ہے کہ ایک شخص نے عملیات کے ذریعے ایک جن کو مسخر کر رکھا تھا۔ اسے پرانی قبر کے نیچے چھپا کر اس سے جو چاہتا کہلواتا۔ اس چیز نے اسے عوام میں صاحبِ کرامت مشہور کر رکھا تھا اور اکثر جہلاء اس کے دامِ فریب میں گرفتار تھے۔ ایک روز عبداللہ شاہ بلوچ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: "یا تو مجھے کوئی کرامت دکھایئے یا پھر میں دکھاتا ہوں۔ تب آپ کو میرا مرید ہونا پڑے گا۔ میں مُردوں کو زندہ کر سکتا ہوں" چنانچہ وہ اُنہیں میانی کے قبرستان میں لے جا کر کہنے لگا۔ "بتلایئے کون سا مُردہ زندہ کروں۔" آپ نے قبر کا نشان دیا۔ اس نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا "یٰسین" اندر سے آواز آئی "والقرآن الحکیم" کہنے لگا: "دیکھئے مُردہ زندہ ہو گیا۔" آپ نے قبر پہ پاؤں دبا کر فرمایا کہ "جو شخص قبر کے اندر چھپا ہے باہر آ جائے۔" اسی وقت ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا قبر سے باہر آ گیا۔ آپ نے پوچھا: "تو کون ہے؟" کہنے لگا میں جن ہوں اور کئی سالوں سے اس شخص کی قید میں ہوں۔" آپ نے فرمایا: "میں تمہیں اللہ کے حکم سے آزاد اور اس شخص کے عملِ تسخیر کو باطل کرتا ہوں۔" جن اُسی وقت غائب ہو گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء۔ ص ۳۲۰)

۴۔ ابوالقاسم قشیری اور سماع کا جواز

اب ہم ایک مثال کے ذریعے آپ کو بتلائیں گے کہ شیطان کس طرح لوگوں کو حضورِ اکرم ﷺ کی شکل بتلا کر صوفیاء کو گمراہ کر سکتا ہے۔

"دُنیائے تصوف میں ابوالقاسم قشیری اور ابوسعید ابوالخیر دونوں مانی ہوئی بزرگ شخصیتیں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ سماع کو صرف علماء ہی ناجائز قرار نہیں دیتے، بلکہ بہت سے صوفیاء نے بھی اسے ناجائز قرار دیا ہے اب واقعہ یہ ہے کہ استاد ابوالقاسم قشیری سماع کو ناجائز اور حرام سمجھتے تھے اور شیخ ابوسعید ابوالخیر اسے جائز سمجھتے اور محفل سماع منعقد کرتے تھے۔ ایک دن ابوسعید ابوالخیر نے محفل سماع رچائی ہوئی تھی، استاد ابوالقاسم وہاں سے گزرے تو دل میں کہا کہ یہ لوگ جوپوں برہنہ سر برہنہ پا، مارے مارے پھرتے ہیں، شریعت میں اُن کا 'ثقہ' ہونا مستند نہیں اور ان کی گواہی کا اعتبار نہیں۔ شیخ ابوسعید نے اسی وقت ایک شخص کو دوڑایا کہ استاد (ابوالقاسم) سے ذرا پوچھو کہ ہم کب بہ حیثیتِ گواہ حاضر ہوئے تھے، جو ہماری گواہی کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہوا، (گویا جو خیال ابوالقاسم کے دل میں آیا تھا وہ فوراً شیخ ابوسعید کو معلوم ہو گیا اور اس کی جوابی کارروائی بھی کر دی۔)

خیر ان دونوں بزرگوں کی آپس میں نوک جھوک ہوتی رہی۔ ایک دن استاد ابوالقاسم نے حضورِ اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ کہیں جا رہے ہیں۔ پوچھا کہاں کا قصد ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "مجلس ابوسعید کا، کہ جو شخص وہاں حاضر نہ ہوگا وہ بدنصیب یا مردُود ہے۔" استاد ابوالقاسم گھبرا کر بیدار اور ابوالخیر کے پاس گئے۔ ایک دفعہ پھر دل میں بدگمانی پیدا ہوئی کہ ابوسعید مجھ سے نہ تو علم میں زیادہ ہے نہ مرتبہ روحانی میں، پھر یہ کیا قصہ ہے؟ ابوسعید پر استاد ابوالقاسم کے اس خیال کا کشف ہو گیا اور دل کی بات ابوالقاسم کو بتلا دی۔ اب ابوالقاسم کا دل صاف ہو گیا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ ابوالقاسم اپنے خیالات سے تائب ہوئے اور برسرِ منبر فرمایا کہ جو شخص ابوسعید کی مجلس میں حاضر نہ ہو وہ مہجور یا مطرود ہے۔" (اقتباس از تصوف اسلام، ص ۶۶)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر جو محفل سماع رچاتے تھے وہ مرتبہ روحانی کے لحاظ سے ابوالقاسم سے بلند تھے۔

۲۔ ابوالقاسم جو سماع کو ناجائز سمجھتے تھے انہیں خود حضورِ اکرم ﷺ نے خواب میں متنبہ فرمایا کہ ابوسعید کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہم اس کی مجلس میں خود جاتے ہیں اور جو نہ جائے وہ بدنصیب یا مردُود ہے۔

۳۔ حضورِ اکرم ﷺ کے اس انتباہ پر ابوالقاسم صرف سماع کے قائل ہی نہیں ہوئے، بلکہ باقاعدہ ابوسعید

کی فضیلت کا اعلان فرمایا۔

اب دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں تو گانا بجانا حرام فرمایا تھا مگر خواب میں آکر اہلِ سماع کو افضل قرار دے رہے ہیں، تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا یا تو یہ افسانہ سرے ہی سے غلط ہے یا جو ہستی خواب میں ملی وہ رسول اللہ کی ہستی نہ تھی کوئی اور تھی۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کوئی اور تعلیم دیں اور خواب میں کچھ اور۔

۵۔ فریبِ شیطانی کی بعض دوسری شکلیں

بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ صاحبِ قبر بزرگ تو عذاب شدید میں ماخوذ ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہاں اس عالم آب و گل میں بحیثیت ولی اور قطب مشہور ہوتا ہے لہٰذا لوگ اس کا عالیشان مزار بھی بنا دیتے ہیں۔ پھر اس کی مجاورت، نذر و نیاز، چڑھاوے وغیرہ سب کچھ اس قبر پر ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ کہ حاجتیں اس کی قبر سے بھی پوری ہو رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک دو واقعات مولانا اللہ یار خان صاحب نے اپنی کتاب "دلائل السلوک" میں درج کیے ہیں جو یہ ہیں:

"ایک مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔ روضہ بنا ہوا ہے۔ قبر پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، بوسے دیئے جا رہے ہیں مگر صاحبِ قبر زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ کتے کی طرح اٹھ اٹھ کر حملے کرتا ہے..... ایک اور ایسے "غوث" کے مزار پر ہر ہفتہ میلہ لگتا ہے۔ حالانکہ صاحبِ قبر کافر سادھو ہے۔ کسی نے غلطی سے دفن کر دیا۔ رفتہ رفتہ غوث بن گیا اور روضہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کو ایسا دردناک اور بھیانک قسم کا عذاب ہو رہا ہے کہ اس سے کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکتی۔" (دلائل السلوک، ص ۱۴۴)

اور ہمارا خیال یہ ہے کہ صاحبِ مزار حضرات کی کثیر تعداد ایسے ہی بزرگوں اور غوثوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن جاہل انسانوں پر شیطان کا فریب کچھ اس طرح مسلط ہوتا ہے کہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی پہنچے ہوئے بزرگ سمجھ کر لوگ ان کی قبروں پر مشرکانہ افعال بجالاتے رہتے ہیں اور لطف یہ کہ حاجتیں ان کی بھی پوری ہوتی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر عقائد سے ہوتا ہے۔ حقائق سے نہیں۔

حاجت روائی کیسے ہوتی ہے؟

اب رہا حاجت روائی کا مسئلہ، تو ایسے بتوں، تھانوں، اور قبروں سے حاجت روائی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ بھی مشیتِ الٰہی کے تحت ہی ہوتی ہیں اور وہ ان قبروں پر دعا، واستغاثہ کے بغیر بھی پوری ہو سکتی تھیں شیطان کو یہ اختیار

ضرور دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے، انہیں جھوٹے وعدے دے (جن پر اس کی قدرت نہیں) اور انہیں گمراہ کرے، لیکن اُسے تصرف فی الامور میں قطعاً کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ وہ قیامت کے دن صاف طور پر کہہ دے گا کہ:

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۱۴/۲۲)

اور جب (حساب کتاب کا) کام فیصل ہو چکے گا، تو شیطان کہے گا (جو) وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا اور (جو) وعدہ میں نے تم سے کیا تھا وہ جھوٹا تھا اور میرا تم پر کسی طرح کا زور نہیں تھا۔ ہاں میں نے تم کو (گمراہی اور باطل کی طرف) بلایا، تو تم نے (جلدی سے بے دلیل) میرا کہنا مان لیا، تو (آج) مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری کا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے بریکٹوں وغیرہ میں کوئی لفظ شامل نہیں کیا۔ اس آیت میں لفظ سلطان کا معنی غلبہ، قوت، زور، اختیار، تصرف اور دلیل سب کچھ لیا جا سکتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ شیطان کا تصرف فی الامور میں کوئی حصہ نہیں۔ وہ اپنی شکل حسب احوال تبدیل کر کے سامنے آ سکتا ہے۔ پکارنے والے کو یا مصیبت زدہ کو اس کے پیر کی شکل میں دکھائی دے سکتا ہے اسے تسلیاں اور جھوٹے وعدے کر سکتا ہے۔ حسین وعدے دکھلا کر گمراہ کر سکتا ہے، دل میں وسوسے ڈال سکتا ہے اور وہ یہ سب کام اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی تمام ذریت سمیت اور اس کے تعاون سے کرتا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ اور وہ گمراہی کے یہ سب کام ہر انسان کے علم اور مرتبہ کے مطابق اور اسی مناسبت سے عیاری سے سرانجام دیتا ہے۔ اس نے خدا سے یہ بھی کہا:

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (۴/۱۱۹)

شیطان (خدا سے) کہنے لگا: میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلوا کر مال کا) ایک مقررہ حصہ لے لیا کروں گا اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا اور سکھاتا رہوں گا کہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں اور یہ بھی کہتا رہوں گا کہ وہ خدا کی بنی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔

اس آیت میں کچھ ایسے افعال کا ذکر ہے جو بتوں یا صاحب قبر کے نام پر کئے جاتے ہیں، تو شیطان کہہ رہا

ہے کہ لوگ ایسے افعال میری ہی ترغیب پر سرانجام دیتے ہیں۔ اور اس نے خدا سے یہ بھی کہا کہ :

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ	شیطان نے (خدا سے) کہا کہ مجھے تو تو نے ملعون کیا ہے میں
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ	بھی تیرے سیدھے راستے پر (ان کو گمراہ کرنے کے لئے)
مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ	بیٹھوں گا۔ پھر اُن کے آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ	اور بائیں سے (غرض ہر طرف سے) آؤں گا اور تو ان میں سے
اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۷/۱۶)	اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

ان آیات میں اور تو سب کچھ ہے مگر شیطان کے تصرف فی الامور کا کہیں ذکر نہیں ملتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر خدا سے دُعا کی جائے، تو وہ اپنی مرضی سے بعض دفعہ تو قبول فرما لیتا ہے اور بعض دفعہ قبول نہیں کرتا (جس کے متعدد وجوہ ہیں جن کا یہاں موقع نہیں) لیکن قبروں اور آستانوں پر نذریں دینے اور دعا و ندا کرنے میں بسا اوقات حاجات جلدی پوری ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان صرف اپنی صوت یا اپنی کلام سے ہی مطمئن نہیں کرتا بلکہ وہ اور اس کا لشکر اس کو پورا کرنے میں حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ یہاں آکر اس شیطانی کاروبار میں کہانت اور جادو بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ کہانت اور جادوگری کے کام بھی انہیں شیاطین کے ذریعہ سرانجام پاتے ہیں۔ جن کے دلائل ہم پہلے دے چکے ہیں کہ یہ صریح کفر ہے، لیکن کہانت و جادو کے نتائج ضرور سامنے آتے ہیں۔ شیطانی کاروبار کی وسعت شیطان اور اس کے لشکر کی استعداد پر منحصر ہوتی ہے۔

شیطان بھی حقیقت میں جنوں کی جنس سے تھا۔ جو اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے عموماً فرشتوں میں رہا کرتا۔ کیونکہ دونوں غیر مرئی مخلوق تھے۔ خدا نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو اس کی اصلی جبلت عود کر آئی۔ سمجھا کہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے برتر مخلوق ہوں اور اس کی فضیلت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تب سے جنات کی یہ جنس یعنی ابلیس اور اس کی پوری ذریت انسان کی گمراہی کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ پھر خبیث قسم کے دوسرے جن بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان "رجال الغیب" سے استفادہ کا کاروبار بھی قدیم سے رائج ہے۔ قرآن میں ہے :

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ	اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے اس
بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۷۲/۶)	سے ان کی سرکشی بڑھ گئی تھی۔

اور آج بھی مسلمانوں میں رجال الغیب سے استمداد کے کئی وظیفے اور جنتر منتر رائج ہیں۔ جنہیں اکثر صوفی

قسم کے لوگ ہی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ "شش قفل" مختلف اقسام کے وضعی درود اور "ہفت ہیکل" جو اکثر پنجسورہ شریفوں میں مذکور ہیں۔ اسی پرانے شرکیہ فعل کی تازہ شکل میں آج بھی موجود ہیں۔

اصل سوال یہ ہے کہ اگر قبروں سے حاجت برآری ثابت ہو بھی جائے، تو کیا یہ بات ان افعال کے صحیح اور جائز ہونے کی دلیل بن سکتی ہے؛ تو اس کا جواب سراسر نفی میں ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے جادو کے عمل کے اثرات قرآن کریم سے ثابت ہونے کے باوجود وہ اسے صریح کفر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ چوری اس لئے جائز ہے کہ اس سے فی الواقع مال مل جاتا ہے اور اس کی شہادتیں بھی پیش کر دے، تو اس سے چوری کا فعل جائز تو نہیں ہو جائے گا؛ ہمیں از روئے شرع صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان اعمال و افعال کا کچھ جواز بھی ہے یا نہیں؛ ان کے نتائج و اثرات کا ہونا یا نہ ہونا زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔

قبروں کے متعلّق ارشاداتِ نبویؐ

دینِ طریقت اور اس کے شرکیہ اعمال و افعال

نبیوں اور ولیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اللہ کی لعنت

دینِ قبر سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی ہر دلعزیزی کے اسباب ہم پہلے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ ان سب شرکیہ امور کی جڑ قبر ہے، لہٰذا اس جڑ کو ختم کرنے کے لئے شریعت نے بہت واضح احکام صادر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَرَضِهِ لَمْ يَقُمْ مِنْهُ: لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔ قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْلَا ذٰلِكَ لَأُبْرِزَ قَبْرُهُ أَخْشٰى أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا"

(بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبیؐ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے اچھے ہو کر نہیں اٹھے، فرمایا: "اللہ یہودیوں پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: "اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ لوگ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیں گے، تو آپ کی قبر مرجع خاص و عام بنا دی جاتی۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ پیچھے قبر شریف اس

کے آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رہائش اور اس سے آگے بیرونی دروازہ تھا۔ قبر تک سوائے حضرت عائشہ یا رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے لوگ جا ہی نہ سکتے تھے، کیونکہ قبر کے پیچھے پھر دیوار تھی، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں کہ اگر آپ کی قبر کے متعلق یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مبادا اصحابہ اور معتقدین سجدہ کرنے لگیں تو بغرض زیارت پچھلی دیوار کھول دی جاتی! اور درج ذیل حدیث میں قبر پرست یہود کے علاوہ عیسائیوں کا بھی ذکر ہے۔

۲۔ اَنَّ عَائِشَۃَ وَعَبْدَ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَا: لَمَّا نَزَلَ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَفِقَ یَطْرَحُ خَمِیْصَۃً لَہٗ عَلٰی وَجْھِہٖ فَاِذَا اغْتَمَّ کَشَفَ عَنْ وَجْھِہٖ وَھُوَ کَذٰلِکَ یَقُوْلُ: لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْیَھُوْدِ وَالنَّصَارٰی اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ یُحَذِّرُنَا مَا صَنَعُوْا (بخاری بحوالہ ایضاً)	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دونوں نے کہا: "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری آن پڑی اور وفات کی علامات ظاہر ہوئیں، تو آپ اپنی چادر اپنے منہ پر اوڑھ لیتے اور کبھی جب بیزاری بڑھتی تو چادر کو اپنے چہرے سے ہٹا دیتے اور یوں کہنے لگتے: "یہود اور نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔" آپ ہم لوگوں کو اس بُرے کام سے ڈراتے تھے، جو انہوں نے کیا تھا۔"

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی جو روایت ہے، اس کے الفاظ میں نبیوں کے ساتھ "ولیوں" کی قبروں کا بھی ذکر ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ مِنْ قَبْلِکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ وَصَالِحِیْھِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھٰکُمْ عَنْ ذٰلِکَ۔	توجہ سے سنو! تم سے پہلے لوگوں نے اپنے نبیوں اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔

مزارات بنانا، اُن کی تزئین، چراغ جلانا اور مجاوری کرنا

اب صحیح مسلم، کتاب الجنائز کی درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ یُّقْعَدَ عَلَیْہِ وَ	حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے (پلستر کروانے)، اور اس پر (مجاور) بیٹھنے اور اس

اَنْ یُّبْنٰی عَلَیْہِ — پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا۔

۲۔ عَنْ اَبِیْ مَرْثَدِ الْغَنَوِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: لَا تُصَلُّوْا اِلَی الْقُبُوْرِ وَلَا تَجْلِسُوْا عَلَیْہَا

ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا: "نہ تو قبروں کی طرف (منہ کر کے) نماز پڑھو اور نہ ہی ان پر بیٹھو۔" (مراقبہ یا اعتکاف کی شکل میں)

اور درج ذیل حدیث، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ سب میں موجود ہے:

۳۔ لَعَنَ اللّٰہُ تَعَالٰی زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْہَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ۔

اللہ تعالیٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے اور اُن مردوں پر بھی جو ان کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور ان پر چراغ روشن کرتے ہیں۔

جعلی یا مصنوعی مزارات

اب ایسی قبریں جن میں کوئی میت نہیں ہوتی، یا کوئی لکڑی، پتھر یا کسی مُردہ جانور کی ہڈیاں وغیرہ دفن کر کے مزارات بنالیے جاتے ہیں اور وہاں بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ملاحظہ فرمایئے۔ فرمایا:

مَنْ زَارَ قَبْرًا بِلَا مَقْبُوْرٍ کَاَنَّمَا عَبَدَ الصَّنَمَ (الحدیث، طبرانی، بیہقی)

جس شخص نے ایسی قبر کی زیارت کی جس میں میت نہیں۔ اس نے گویا کسی بُت کی پوجا کی۔

غور فرمایئے یہ تہدید صرف زیارت کی ہے۔ پھر جو شخص ایسی بلا مقبور قبروں پر دوسرے افعال بھی بجا لائے، تو آپ اس کی سزا کا خود اندازہ کر لیجیے۔

سابقہ مزارات کا انہدام

صحیح مسلم کتاب الجنائز میں ہے:

عَنْ اَبِی الْہَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ قَالَ قَالَ لِیْ عَلِیٌّ: اَلَا اَبْعَثُکَ عَلٰی مَا بَعَثَنِیْ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا تَدَعَ تِمْثَالًا اِلَّا طَمَسْتَہٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّیْتَہٗ۔

حضرت ابوالہیاج اسدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "کیا میں تمہیں ایسے کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا، اور وہ یہ ہے کہ تو کوئی مجسمہ نہ چھوڑ مگر اسے مٹا دے اور نہ کوئی ایسی قبر چھوڑ جو زمین سے بلند ہو مگر یہ کہ اُسے زمین کے برابر کر دے۔

احادیث سے صرف قبر کی اتنی بلندی کی اجازت ہے، جیسے اونٹ کی کوہان ہوتی ہے وہ بھی اس لئے کہ اتنی مٹی بچ جاتی ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قبر کو تو سجدہ گاہ نہ بنایا جائے۔ بلکہ قبر کے پاس مسجد بنالی جائے۔

قبر کے پاس مسجد بنالینا

صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو انہوں نے حبشہ میں "ماریہ" نامی ایک کنیسہ (یہودیوں کی عبادت گاہ) دیکھا ہے۔ جس میں مجسمے تھے، تو آپ نے فرمایا:

اِنَّ اُولٰٓئِکَ اِذَا کَانَ فِیْہِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ	جب ان لوگوں میں سے کوئی صالح مرد مر جاتا، تو اس کی قبر
فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰی قَبْرِہٖ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِیْہِ	پر مسجد بنالیتے اور پھر اس میں اس کے مجسمے رکھ لیتے۔ ایسے
تِلْکَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِکَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰہِ عَزَّ	لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔
وَجَلَّ	(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ)

اور اس مسئلہ کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا ہی ناجائز ہے۔ خواہ وہاں کسی ولی یا بزرگ کی قبر ہو یا نہ ہو۔

قبرستان میں نماز ناجائز ہے

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ	ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْاَرْضُ	تمام روئے زمین نماز کے قابل ہے۔ سوائے قبرستان
کُلُّہَا مَسْجِدٌ اِلَّا الْمَقْبَرَۃَ وَالْحَمَّامَ (ترمذی)	اور حمام کے۔

اب ان احادیث کی روشنی میں خود فیصلہ کر لیجئے کہ آیا شریعت مطہرہ میں پختہ قبر، مزار یا روضہ بنانے، اس پر مجاور بیٹھنے، اس پر روشنی کرنے، اس پر جھاڑ دینے، غلاف چڑھانے، وہاں اعتکاف بیٹھنے، نماز پڑھنے یا ساتھ ہی مسجد بنانے کی کوئی گنجائش ہے۔ پھر جو اولیاء، دوسرے اولیاء اللہ کے مزارات پر معتکف ہوتے، مراقبے کرتے یا چلہ کشی کرتے ہیں وہ متبع سنت کہلا سکتے ہیں؟

اب مزارات کی ضرورت اور مجاورت کی اہمیت سے متعلق صوفیہ کی ایک مایہ ناز ہستی علی ہجویریؒ کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

صوفیاء اور قبروں کی مجاورت

حضرت علی ہجویری فرماتے ہیں:

"اور مجھے بھی (یعنی حضرت علی بن عثمان جلابی کو) ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ گزرا۔ میں نے اس امید پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ واقعہ حل ہو مگر حل نہ ہوا اور ایک دفعہ اس سے قبل بھی ایسا واقعہ پیش آیا تھا تو میں مزار حضرت شیخ بایزید کا اس وقت تک مجاور رہا جب تک وہ حل نہ ہوا۔ آخر حل ہو گیا۔" (کلام المرغوب ص ۱۱۱، اردو ترجمہ کشف المحجوب، مصنفہ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش)

یہ واقعہ جہاں مزارات کی بزرگی کی روشن دلیل ہے، وہاں اس سے حلِ مشکلات کے لئے اس کی مجاوری کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ معین الدین چشتی اجمیری نے انہی علی ہجویریؒ کی قبر کا چلہ کاٹا تھا اور مجاورت اختیار فرمائی تھی اور جاتی دفعہ یہ شعر کہہ گئے۔ ؎

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا   ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

اور یہ شعر آج تک ان کے مزار کی زینت اور اجمیری صاحب کی یادگار ہے۔ غرض صوفیاء میں یہ مزارات اور اُن کے فیوض کا سلسلہ ایک لابدی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

قبر النبیؐ سے متعلق موضوع احادیث

شریعت نے قبروں کے ذریعے پیدا ہونے والے ایک ایک چور دروازے کو بند کر دیا تھا۔ ان حضرات نے ایک ایک کر کے ان کو پھر سے کھول دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے خود اپنے متعلق فرمایا تھا کہ:

لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَاِنَّ صَلٰوتَکُمْ یَبْلُغُنِیْ	میری قبر کو عید (عرس یا میلہ) نہ بنانا اور جہاں کہیں تم ہو وہیں سے درود پڑھ لیا کرو۔ بلاشبہ تمہارا درود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس ارشاد کی رُو سے آپ نے مسلمانوں کو اپنی قبر پر حاضری دینے کو پسند نہیں فرمایا۔ رہی درود پڑھنے کی فضیلت اور ضرورت، تو اس کے متعلق بھی آپ نے وضاحت فرما دی کہ تمہارا درود، جہاں بھی تم ہو، مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس غرض کے لئے میری قبر پر آنے کی ضرورت نہیں۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ	اے اللہ! میری قبر کو آستانہ نہ بنا دینا کہ لوگ آکر پوجا کرنے لگیں۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود لوگوں نے آپؐ کی قبر کی زیارت، فضیلت اور اہمیت کی بھی حدیثیں گھڑ لیں: مثلاً یہ حدیث:

(۱) مَنْ زَارَنِیْ بَعْدَ مَمَاتِیْ فَکَاَنَّمَا زَارَنِیْ فِیْ حَیَاتِیْ — جس نے میرے مرنے کے بعد میری زیارت کی۔ گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

یہ حدیث مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر موضوع ہے:

۱۔ حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کا کوئی نشان نہیں۔ ابن قدامہ نے اپنی کتاب الصارم المنکی علی نحر ابن سبکی میں آپؐ کی قبر کی زیارت کے متعلق سب حدیثوں کو پرکھ کر ان کا واہی ہونا ثابت کیا ہے (مشکوٰۃ، باب حرم المدینہ، الفصل الثالث، حاشیہ بر روایت مذکورہ)

۲۔ فقہائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بعد کے لوگ کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے صرف قبر کی زیارت سے یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اگر اس بات میں صداقت ہوتی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر بند نہ رکھی جاتی ۵۸ھ تک حضرت عائشہ زندہ رہیں۔ اس وقت تک کوئی غیر محرم وہاں داخل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو زیارت کا اہتمام ضروری تھا۔

اب زیارتِ قبر سے متعلق چند دوسری موضوع احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے:

(۲) من حج ولم یزرنی فقد جفانی — جس نے حج کیا اور میری قبر کی زیارت نہ کی، تو اس نے مجھ پر جفا کی۔

(۳) من زار قبری وجبت لہ شفاعتی — جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

(۴) من زار قبری (او قال) من زارنی کنت لہ شفیعا او شہیدا — جس نے میری قبر کی (یا راوی نے کہا) میری زیارت کی میں اس کا شفیع یا شہید ہوں گا۔

ایسی سب روایات جو آپؐ کی قبر کی زیارت کی فضیلت بتلاتی ہیں، تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتابوں میں درج ہیں اور مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر مجروح یا موضوع ہیں اور یہی وہ موضوعات ہیں جن پر صوفیاء کے عقائد متعلقہ قبور، کشف قبور اور مراقبات وغیرہ کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔

قبروں سے متعلق صوفیاء کا ذہنی انتشار

پھر بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو ماشاء اللہ علم شریعت کے ماہر ہیں۔ مگر ان کا دامن طریقت میں اُلجھا ہوا ہے۔ جب یہ حضرات شریعت کی بات کرتے ہیں، تو تمام تر دلائل اس کی حقانیت میں صرف کر دیتے ہیں، لیکن جب طریقت کی طرف آتے ہیں جو پہلی سب باتیں اور دلائل بھول جاتے ہیں اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ دونوں قسم کی تصانیف فردِ واحد کی نہیں ہو سکتیں اور ایسے علما کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم اس انتشار کی دو مثالوں سے وضاحت کریں گے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدماتِ اسلامی سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ آپ نے ایک کتاب "البلاغ المبین (فارسی) میں پیر پرستی اور قبر پرستی کا نہایت مدلل اور تحقیقی انداز سے رد کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۰ پر صحیح بخاری کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرماتے ہیں:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو قبر کے پاس نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: "اَلْقَبْرَ اَلْقَبْرَ" وہ گویا حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ڈرا رہے تھے کہ اس کام سے بچو۔ جیسے کسی کو شیر شیر یا سانپ سانپ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ محتاط ہو جائے۔

شاہ ولی اللہ اور کشف قبور

اب انہی شاہ صاحب کا درج ذیل بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

" ذکر کشف قبور۔ جان کہ ذکر کشفِ قبور کے واسطے اول جب مقبرہ میں آئے دوگانہ ان بزرگ کی روح کے واسطے پڑھے اگر سورۂ فاتحہ یاد ہو پہلی رکعت میں پڑھے اور دوسری میں سورۂ اخلاص اور نہیں تو ہر رکعت میں پانچ پانچ بار اخلاص پڑھے اور پھر قبلہ کی پیٹھ کر کے بیٹھے اور ایک بار آیت الکرسی اور بعض سورتیں جو زیارت کے وقت پڑھتے ہیں، جیسے سورۂ ملک اور اس کے سوا۔ بعدہٗ قل کہے بعد فاتحہ کے گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھے اور ختم کرے اور تکبیر کرے۔ بعدہٗ سات دفعہ طواف کرے اور اس میں تکبیر پڑھے اور پھر پاؤں کی طرف رخسار رکھے اور نزدیک میت کے منہ کے بیٹھے اور کہے 'یارب' اکیس دفعہ۔ بعدہٗ دل طرف آسمان کے کہے "یا روح" اور دل میں ضرب کرے "یا روح الروح"۔ جب تک کہ انشراح پائے یہ ذکر کرے۔ انشاء اللہ کشفِ قبور و کشفِ ارواح حاصل ہو گا۔" (انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحب، ص ۱۱۳، ۱۱۴)

شاہ صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے درج ذیل چیزوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ مقبروں اور مزاروں کا جواز۔

۲۔ نذر لغیر اللہ کا جواز۔ کیونکہ دو رکعت نماز محض ایصالِ ثواب کے لئے نہیں پڑھی جا رہی۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد بھی ہے اور یہی چیز "نذر" کہلاتی ہے۔

۳۔ قبروں کے گرد طواف کا جواز۔ ۴۔ صاحب قبر کے پاؤں کی طرف رخسار رکھنے کا جواز۔

۵۔ غیر اللہ کو پکارنے کا جواز، اور

۶۔ قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے کی حکمت و آداب تو شاہ صاحب خود ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

اب اگر اتنی باتیں شاہ صاحب جیسے بزرگ اور عالم دین سے ثابت ہو جائیں، تو اگر عام لوگ اس میں قبروں پر چراغ جلانے، جھاڑو دینے اور ان صاحب قبور سے مرادیں مانگنے کا اضافہ کرلیں تو ان بے چاروں کا کیا قصور ہے

اسی طرح ایک اور بزرگ ابن حجر مکی (م ۹۷۲ھ) ہیں ان کے متضاد بیانات بھی ملاحظہ فرمایئے:

ابن حجر مکی کا ذہنی انتشار

نبہانی نے جن لوگوں سے استفادہ کیا، ان میں سے ایک ابن حجر مکی ہے۔ ابن حجر اپنی کتاب "الزواجر" میں کہتے ہیں: "شرک کا سب سے بڑا سبب قبروں کے پاس نماز پڑھنا اور ان کو مساجد بنا لینا ہے۔ جتنے منکرات مزاروں اور قبروں پر ہوتے ہیں ان کو ہٹانا اور مٹانا واجب ہے۔ قبروں پر تعمیر شدہ قبوں اور مزاروں کو جلد از جلد گرا دینا چاہیئے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے روکا اور قبروں کو گرانے کا حکم دیا۔ لہٰذا قبروں پر دیئے، قندیلیں اور قمقمے سب ختم کر دیئے جائیں۔ ایسی جگہوں کے لئے کوئی چیز وقف کرنا اور نذر و نیاز ماننا اور اس کو پورا کرنا صحیح نہیں ہے۔ قبروں پر دیئے جلانا، ان کو بُت بنانا، ان کا طواف کرنا اور ان کی طرف نماز پڑھنا۔ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

مگر الجواہر المنظم میں خود ہی ان سب باتوں کی تردید کر دی اور "تحفہ" اور "الزواجر" میں جن کاموں کو کبیرہ گناہ اور اسباب شرک بنایا تھا ان کو جائز کر دیا۔ یہاں تک کہ قبروں کو سجدہ کرنا، اہلِ حال کے لئے جائز قرار دیا اور اتنا غلو کیا کہ غالیوں کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔ (غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی، مصنفہ علامہ آلوسی)

یہ دو مثالیں ہم محض بطورِ نمونہ پیش کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو علمائے دین بھی اس طریقت کے میدان میں گھسے ہیں۔ آپ ان کی مختلف تصنیفات کا مطالعہ کریں گے تو ایسی ہی صورتِ حال سامنے آئے گی۔

باب (۷)

کچھ ولایت کی تعلیم اور اولیاء اللہ کے بارے میں

ا۔ تعلیماتِ ولایت

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ دورِ نبوی، صحابہ یا تابعین میں لفظ ولی (جمع اولیاء) ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ جن معنوں میں تیسری صدی کے صوفیاء نے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ حمایتی اور دوست کے معنوں میں استعمال کیا تھا اور جو شخص دینِ اسلام کو قبول کر لیتا، اسے اللہ کا ولی کہہ کر پکارا جاتا، لیکن تیسری صدی میں صوفیہ نے یہ لفظ جن معنوں میں لیا وہ کچھ اس طرح ہے:

ولایت کا نیا مفہوم

" ولایت سے مراد محبت و تصرفِ قرب ہے۔ پس جو شخص محبتِ الٰہیہ میں مستغرق ہو کر تصرف میں کاملیت اختیار کر کے قرب حاصل کر لیتا ہے، وہ والیٔ ولایت ہو کر ولی کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیشوائے کامل چاہے تو ایک نگاہ سے طالب کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۲۷۵)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ ولایت کے مفہوم میں تصرفِ امور کا اضافہ مابعد کے دور کی پیداوار ہے۔

۲۔ فی الحقیقت اس قسم کی ولایت کی منزلِ مقصود یہی تصرفِ امور ہے۔

۳۔ اور یہ منزلِ مقصود کسی "مرشدِ کامل" کے بغیر ہاتھ نہیں آ سکتی۔

اب دیکھئے کتاب و سنت کی رو سے تصرف فی الامور کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ — یاد رکھو ! اگر پیدائش اللہ کی ہے ، تو حکم بھی اسی کا چلے گا۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا :

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ — (اے پیغمبر ﷺ) آپ ان لوگوں سے کہدیجئے کہ اَمر پورے کا پورا اللہ کے لئے ہے۔ (۳/۱۵۴)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہ کسی کا کچھ سنوار سکتا ہے اور بگاڑ سکتا ہے اب اگر کسی دوسرے شخص یا چیز سے ایسا تصرف ظاہر ہو تو وہ کتاب و سنت کے خلاف ہی کوئی بات ہو سکتی ہے ۔ جیسے جادوگر اپنے جنتر منتر کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہم پہلے باب میں بحوالہ شاہ ولی اللہ صاحب یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ جادو، کہانت ، رمل ، مسمریزم وغیرہ کئی علوم و فنون ایسے ہیں جن سے مخاطب کے دِل کا حال اور اس کی کیفیت (اشراف) اور آئندہ کے غیب کے احوال (انکشاف) معلوم ہو جاتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے نام نہاد صوفیاء نے یہ تصرف فی الامور کی منزلِ مقصود کو اپنانے کے لئے کیا طریق اختیار کیا ہے ۔ صاحب ریاض السالکین سورۃ فاتحہ کے خواص کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ :

ولایت کی تعلیم

"دعوت سورۃ فاتحہ[1] حضرت محمد ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی ۔ انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو انہوں نے امام زین العابدین کو، انہوں نے امام باقر کو ، انہوں نے امام جعفر کو، انہوں نے امام موسیٰ کاظم کو اس کے عمل کی اجازت دی ۔ حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے انیس برس دعوت چہل اسماء اور قرشیہ اور تسخیر میں صرف کئے ہیں فائدہ کما حقہ، نہ دیکھا ۔ اتفاقاً امام جن و انس حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض حال بیان کیا۔ آپ نے کمال لطف سے فرمایا : "یا طیفور ! (بایزید کا اصل نام) ابھی منزلِ مقصود دور ہے ۔" (ریاض السالکین ، ص ۳۳۳)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

---

[1] ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ جب عثمان ہارونی ؒ نے آنکھیں بند کر کے دریا کو پار کیا تھا، تو پانچ مرتبہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھی تھی اور جب ایک ہندو بچہ کو بادشاہ نے ظلم کے تختہ دار پر کھینچا تھا، تو آپ نے سورۃ فاتحہ کے عمل ہی سے اسے زندہ کر دکھایا تھا، پھر ایک دفعہ ایک لڑکے کو جو کسی جزیرے میں قید تھا، آزاد کر کے سورۃ فاتحہ کے ہی عمل سے گھر لے آئے تھے ۔ دوسرے اولیاء اللہ بھی سورۃ فاتحہ کے اس عمل سے بکثرت فائدہ اٹھاتے اور کرامات دکھلاتے ہیں ۔

۱۔ سورۂ فاتحہ کے خواص اور اس کی دعوت کا طریقہ بھی دین کا حصہ ہیں۔

۲۔ یہ دین کا حصہ حضورِ اکرم ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتلایا یا اس کی اجازت دی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صرف اُن صاحبزادوں کو بتلایا، جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے۔ اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی نہیں بتلایا۔

۳۔ یہ دین کا حصہ دعوت چہل اسماء، قرشیہ اور تسبیح پر مشتمل ہے۔

۴۔ اس دعوت چہل اسماء، قرشیہ اور تسبیح سے ہی منزلِ مقصود حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ بایزیدؒ (گروہ صوفیہ انہیں سلطان العارفین کے لقب سے پکارتے ہیں) نے انیس برس اس دعوت پر صرف کئے مگر کما حقہٗ فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ انہوں نے کسی "مرشد کامل سے اجازت" نہیں لی تھی۔ لہٰذا منزلِ مقصود کے لئے یہ اجازت انتہائی لازمی شرط ہے۔

۶۔ امام موسیٰ کاظم انسانوں کے علاوہ جنوں (رجال الغیب) کے بھی امام تھے۔

چہل اسماء اور منزل مقصود

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس چہل اسماء، قرشیہ اور تسبیح کی دعوت ہے کیا چیز؟ اور منزلِ مقصود کیا ہے؟ تو ان سوالوں کا جواب اگلی عبارت میں ملاحظہ فرمائیے، بایزید فرماتے ہیں کہ:

"میں نے عاجزی سے اپنا سر امام (موسیٰ کاظم) کے آگے رکھ دیا اور عرض کیا کہ یا امام مجھے تعلیم فرمائیے کہ راہِ ہدایت میسر ہو اور قوتِ دعوت کی حاصل ہو اور بھید مکاشفات اور مراقبات کھل جائیں۔ امام نے فرمایا کہ واللہ اگر ہزار برس تک دعوت کرتا رہے گا کچھ حاصل نہ ہو گا جب تک ہماری اجازت سے سورۂ فاتحہ کی دعوت نہ کرے۔ میں نے پھر عرض کی کہ یا حضرت تعلیم فرمائیے۔ بعد مدت کے آپ نے خلوت کی اجازت دی۔ ۳۹ دن تک دعوت میں مشغول رہا۔ ۳۸ ویں روز چار مؤکل بہت سے کواکب کے ساتھ میرے پاس آئے اور السلام علیکم کی اور میں نے سلام کا جواب دیا، تو انہوں نے کہا کہ اے صاحبِ دعوت! ہم اس لئے حاضر ہوئے کہ تیری خدمت بجا لائیں، اپنا مدعا بیان کر۔ ہم سب فرمانبردار (اسماء چہل) کے ہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے ملک ارواح میں تمام جن و انس کے پیدا کئے ہیں، ہمارے تحت و تصرف میں ہیں۔ ان میں سے ایک نے فرمایا: "میرا نام ارفائیل ہے اور جبرائیل بھی کہتے ہیں۔ چار ہزار گروہ فرشتوں کا میرے تحت و تصرف میں ہے اور تمام ارواح اس عمل کے پڑھنے والے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ دوسرے مؤکل نے کہا: کہ

میرا نام میکائیل ہے۔ لاکھ ارواح جن وانس میرے فرمان میں ہیں۔ صاحب دعوت جس کام کا حکم دے فوراً بجالائیں۔ تیسرے مؤکل نے کہا کہ میرا نام سرفائیل ہے اور اسرافیل بھی کہتے ہیں۔ تمام جن وانس و شیاطین اور ارواح ارضی وسماوی اس اسم کے تابع ہیں اور سب میرے مطیع و فرمانبردار ہیں، جو فرمایا جائے فوراً بجالائیں۔ چوتھے مؤکل نے کہا کہ میرا نام شیخ ہے اور عزرائیل بھی کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے مجھ کو سب بزرگیاں عنایت فرمائی ہیں۔ میرے بارہ ہزار تین سو ملک اور ساٹھ ہزار جن وانس تابع ہیں۔ جب صاحب دعوت مجھ کو طلب کرے حاضر ہوں۔ میں نے بخور آگ میں ڈال کر ان کو رخصت کیا۔ چالیس روز کے بعد امام زمان کے قدم بوس ہوا۔ امام نے میرے اوپر بہت سے لطف اٹھا کر مجھے رخصت کیا اور فرمایا جس کو لائق سمجھو اسے اجازت دینا۔" (ریاض السالکین، ص ۳۳۳، ۳۳۴)

یہ تھا وہ سورۃ فاتحہ کی دعوت کا "خاص الخاص" طریقہ جسے حضور اکرم ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمایا تھا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹوں کو بتلایا۔ پھر آئمہ شیعہ کے واسطے سے ہوتے ہوئے بایزید تک پہنچ گیا۔ پھر بایزید نے امام موسیٰ کاظم کا تہ دل سے شکریہ بھی ادا کیا، کیونکہ وہ انتیس سال سے کشف و مجاہدہ میں پڑے ہوئے تھے اور انہیں منزل مقصود ہاتھ نہ آئی تھی۔

مؤکلین کی قوت

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں کا مزید پتہ چلتا ہے:

۱۔ تصرف فی الامور، جو ولایت کا ایک حصہ ہے، رجال الغیب سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ کتاب و سنت کی پیروی سے۔

۲۔ سب سے کمزور مؤکل ارفائیل یا جبریل (فرشتہ ہے) جس کے تحت صرف چار ہزار فرشتوں کا گروہ ہے۔ دوسرا مؤکل میکائیل پہلے مؤکل جبریل سے بہت زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اس کے تحت ایک لاکھ یا ۲۵ گنا زیادہ جن وانس ہیں۔ تیسرا مؤکل سرفائیل یا اسرافیل دوسرے سے بھی بہت زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اس کے تحت تمام ارضی وسماوی ارواح اور جن وانس ہیں۔ چوتھے مؤکل شیخ یا عزرائیل کی شان سب سے بالا ہے۔ اگرچہ اس کے تابع جن وانس تو صرف ساٹھ ہزار ہیں مگر اس کے پاس بارہ ہزار تین سو ملک بھی تو ہیں۔

۳۔ اگر "مرشد کامل" کی اجازت ہو تو ۴۰ دن کے چلے کے آخر تک سب حاضر ہو کر اپنے مسخر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں اور اس طرح صاحب دعوت ہر طرح کے تصرف فی الامور پر قادر ہو جاتا ہے۔

۴۔ یہ موکل جب اپنی فرمانبرداری کا اعلان کرنے آتے ہیں، تو اس وقت تک رخصت نہیں ہوتے جب تک آگ پر بخور نہ ڈالا جائے۔

چلہ کاٹنے کا طریقہ

اس کے بعد صاحب ریاض السالکین اس چلہ بیٹھنے کا طریقہ بتلاتے ہوئے دعوت سورہ فاتحہ کو زکوٰۃ سورۃ فاتحہ میں بدل دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

"طریقہ زکوٰۃ سورۃ فاتحہ شریف یہ ہے کہ اوّل ترک حیوانات جلالی وجمالی کرے اور عروج ماہ میں دوشنبہ کے روز روزہ رکھے اور رات کو خلوت میں بیٹھ کر ہر شب میں ہزار ہزار مرتبہ چالیس یوم تک پڑھا کرے اور جب تک چلہ تمام نہ ہو خلوت سے باہر نہ آئے مگر ضرورت پر مضائقہ نہیں اور بعد ہر صدی کے درود پڑھے۔ پھر جس کام کے لئے پڑھے وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ پھر ہمیشہ کے لئے اسی مقدار میں پڑھتا رہے نہایت مجرب عمل ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۳۴)

دیکھ لیا آپ نے ہمارے یہ بزرگانِ دین، اولیائے کرام چلے جو کاٹتے پھرتے ہیں، تو ان کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ پھر کوئی بزرگ تو اس کے لئے ویرانہ کا انتخاب کرتے ہیں یا جنگل کا۔ کچھ قبر کھود کر اس میں بیٹھ جاتے ہیں اوپر ڈھکنا رکھ دیتے ہیں۔ کوئی دریا کا کنارہ تلاش کر لیتے ہیں اور فریدالدین گنج شکرؒ نے تو یہ چلہ کنوئیں میں بیٹھ کر کاٹا تھا (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۷۸) اور یہی تھی وہ منزلِ مقصود جس کے لئے بایزید انتیس سال تک محنت کرتے رہے۔ غور فرمائیے ان باتوں میں سے کوئی بات بھی شریعت سے مطابقت رکھتی ہے؟

ہمارے خیال میں یہ روایت کئی لحاظ سے غلط ہے۔ ہم نہ حضور اکرم ﷺ کو اور نہ ہی دوسرے اماموں کو اس قدر نچلی سطح پر لانا چاہتے ہیں اور بایزید کے متعلق بھی معتبر روایت تو یہی ہے کہ وہ کشف و کرامات کو قطعاً معیارِ ولایت نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہ خود تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت و مشاہدہ میں مشغول رہے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۸۹) ہو سکتا ہے پہلے وہ اسی "منزلِ مقصود" کے لئے جنگلوں میں ریاضت و مشاہدہ کرتے رہے ہوں اور آخری عمر میں انہیں احساس ہو گیا ہو کہ یہ کشف و کرامات معیارِ ولایت نہیں ہوتے۔ اور بمصداق "من نہ کردم شما حذر بکنید" آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ:

"اگر کسی کو پانی پر چلتا یا ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو ..... یہ ولایت کے لئے ضروری نہیں" (صوفیائے نقشبند ص۱۷)

ولایت اور کشف وکرامات کا تعلق

کچھ بھی ہو عوام الناس کا ذہن بھی کچھ ایسا ہی بن گیا کہ وہ ولایت اور کشف وکرامات کو لازم وملزوم سمجھنے لگے۔ تیسری صدی کے بعد آنے والے بیشتر صوفیائے کرام بھی انہیں طور طریقوں، یعنی جنگلوں میں ریاضتوں، چاروں ترک چلوں، مزاروں اور قبروں پر چلے کشیوں کے ذریعہ کشف وکرامات کو حاصل کر کے اپنی ولایت کا ثبوت مہیا کرنے لگے۔ جو کوئی جتنا صاحبِ کرامات ہوتا اتنا بڑا اولی اور ابدال وقطب یا غوث سمجھا جانے لگا۔ پھر تحریر کی صورت میں ان صوفیائے کرام کے تذکروں نے بھی یہ ثبوت مہیا کر دیا کہ اصل ولایت محض نام ہے۔ کشف وکرامات کا اور توجہ کے ذریعہ تصرف فی الامور کا۔

۲۔ اولیاء اللہ کے باہمی مقابلے

۱۔ اولیاء ہند اور اولیائے افغانستان کا مقابلہ

صوفیائے نقشبند کے مصنف سید امین الدین احمد رقمطراز ہیں کہ:

"ایک روز ایک درویش، جو خاندانِ چشتیہ سے منسلک تھے۔ عجب نور (جو نقشبندی تھے)، کے پاس آئے اور اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ اولیائے ہندوستان زبردست ہیں یا اولیائے افغانستان۔ بعد نمازِ عشاء اللہ نور (عجب نور کے بھائی اور نقشبندی) نے ایک پتھر لا کر رکھ دیا اور چشتی صاحب سے کہا کہ آپ اس پر توجہ کریں، فقیر بھی توجہ کرے گا۔ چشتی صاحب نے اسمائے الٰہی کی ضربات کا بہت زور لگایا لیکن اس پتھر پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد خلیفہ اللہ نورؒ نے بسم اللہ شریف اور کلمہ تمجید پڑھ کر اسمِ ذات کی ضربات لگانا شروع کیں۔ بفضلِ الٰہی پتھر حرکت میں آگیا۔ گاؤں کا سردار اس پتھر کو تبرکاً اپنے گھر لے گیا اور باقی گاؤں کے تمام لوگ حضرت خواجہ صاحب کے سلسلہ نقشبندیہ میں داخل ہو گئے" (صوفیائے نقشبند ص۱۸۹)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ عوام وخواص کا ذکر تو در کنار، اِن "اولیاء اللہ" کا اپنا ذہن بھی یہی رہا ہے کہ کرامات وتصرف ہی کا دوسرا نام ولایت ہے۔

۲۔ اسمائے الٰہی سے ضربات لگانے اور کرامات دکھلانے کے لحاظ سے طریقہ نقشبندیہ، چشتیہ

سے زیادہ کارگر اور مفید ہے۔

۳۔ اِن "اولیاء اللہ" کا عوام کو اپنے قریب کرنے، اپنے سلسلہ میں داخل کرنے یا اسلام کی طرف مائل کرنے کا یہی گُر تھا۔

۲۔ رجالُ الغیب کا مقابلہ

پہلا مقابلہ تو توجہ کے ذریعے کرامات دکھلانے کا تھا کہ اب اولیاء اللہ کے براہِ راست تصرف کے مقابلہ کا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صاحب ریاض السالکین لکھتے ہیں کہ:

"جب شاہِ ایران نے بغداد پر فوج کشی کی تو خلیفہ اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر آپ (پیرانِ پیر) سے مدد کا طالب ہوا۔ آپ نے علی بن الہیتی سے فرمایا کہ تم عجم کے لشکر میں جاؤ۔ سب سے پیچھے ایک چادر کا خیمہ ملے گا۔ اس میں تین شخص ہوں گے ان سے کہدو کہ وہ واپس چلے جائیں۔ اگر وہ کہیں کہ ہم کسی کے حکم سے آتے ہیں، تو تم بھی یہی جواب دینا کہ میں بھی کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ غرض شیخ علی بن الہیتی نے اس طرح جا کر خیمہ تلاش کیا۔ اس میں واقعی تین شخص تھے۔ ان کو کہا، تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم کسی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اُن کے جواب میں آپکے خادم نے بھی یہی کہا کہ میں بھی کسی اور ہی کے حکم سے آیا ہوں۔ یہ سُن کر وہ سب واپس چلے گئے۔ ان کی واپسی کے ساتھ ہی عجمی فوج میں ایک گڑبڑ سی مچ گئی اور وہ بھی بھاگ نکلے۔ آپ (یعنی پیرانِ پیر) کی کرامات بے شمار ہیں۔" (ریاض السالکین ص[۲۱])

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ پیرانِ پیر کے زمانہ تک "اولیاء اللہ" کی کرامات و تصرفات کا عقیدہ اتنی ہمہ گیر صورت اختیار کر چکا تھا کہ شاہانِ وقت، خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، مسلمان ہوں یا کافر، جنگ میں فتح و شکست تک کے معاملات میں ان اولیاء اللہ کے تصرفات پر انحصار کرتے تھے۔

۲۔ شاہِ ایران نے تین مختلف اولیاء اللہ سے استمداد لی اور انہوں نے اپنا اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ یا ایک ہی ولی سے استمداد پر اس نے اپنے تین نمائندے بھیجے؟ یہ وضاحت تذکرہ نگار بھول گئے۔ جو کچھ بھی ہوا بہرحال یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ شاہِ ایران کے ولی یا اولیاء کے نمائندے، پیرانِ پیر کے نمائندے کے مقابلے میں دُم دبا کر بھاگ نکلے۔ یہ ہار دراصل شاہِ ایران کی نہیں، بلکہ ان اولیاء اللہ اور ان کے رجال الغیب کی تھی۔

۳۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے یہ طریقے نہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھے نہ خلفائے راشدین کو۔ ایسے طریقوں کی ایجاد بہت دیر بعد کی پیداوار ہے۔

۳۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) اور محمد غوث گوالیار کا مقابلہ

"محمد غوث گوالیاروی، جو کتاب "جواہر خمسہ" کے مصنف ہیں، عامل تھے۔ انہوں نے عبدالقدوس گنگوہی کو لانے کے لئے ایک مرتبہ جنوں کو بھیجا۔ شیخ مسجد میں مشغول تھے۔ جن پہنچے، تو خود ہی سر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا کون ؟ جنوں نے جواب دیا کہ "محمد غوث نے بھیجا ہے وہ زیارت کا مشتاق ہے۔ اجازت ہو تو ہم اس طرح لے چلیں کہ تکلیف نہ ہو۔" حضرت نے فرمایا: "میں حکم دیتا ہوں کہ محمد غوث کو لے آؤ۔" چنانچہ جنات واپس پہنچے اور محمد غوث کو لے کر چلے انہوں نے جنات سے دریافت کیا کہ "اس کی کیا وجہ ہے، تم تو میرے مطیع تھے، یہ سرکشی کیسی ؟" جنوں نے جواب دیا کہ "سب کے مقابلہ میں تو تمہارے مطیع ہیں، مگر شیخ (عبدالقدوس گنگوہی) کے مقابلے میں تمہاری اطاعت نہیں[1]۔" غرض ان کو لے کر شیخ کی خدمت میں پہنچے، تو شیخ نے محمد غوث کو دیکھ کر فرمایا "تمہیں شرم نہیں آئی۔" اور بہت ڈانٹا۔ آخر وہ بیعت ہو کر صاحب نسبت ہو گئے۔ گوالیار میں ان کا مزار ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۰۶)

اس اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ محمد غوث اور عبدالقدوس گنگوہی دونوں جنات یا رجال الغیب کے عامل تھے۔ لیکن عبدالقدوس اس فن میں ماہر تھے، جنہوں نے محمد غوث اور اُن کے جنوں کو بھی مطیع کر لیا، لہٰذا عبدالقدوس بڑے ولی ہوئے اور محمد غوث چھوٹے ولی۔

۲۔ مروجہ ولایت اسی طرح کی تسخیر رجال الغیب اور شعبدہ بازیوں کا مقدس نام ہے اور اس کا شریعتِ محمدی کی اتباع سے کوئی تعلق نہیں۔ شریعت کی اتباع کا نام صرف جاہل مسلمانوں کو اس جال میں پھنسانے کے لئے لیا جاتا ہے۔

۴۔ مولانا درویش محمد اور حسین خوارزمی کا نسبت سلب کرنے کا مقابلہ

شیخ حسین خوارزمی اپنے وقت کے مقتدر تھے۔ جہاں کہیں جاتے وہاں کے مشائخ آپ کے تصرفات کے مقابلے میں ماند ہو جاتے تھے۔

---

[1] شاید "لا طاعۃ فی معصیۃ اللہ" کا بھی مفہوم ہو۔

جب کوئی درویش آپ سے ملنے آتا تو آپ اس کی نسبت سلب کر لیتے۔ ایک دفعہ شیخ مولانا درویش محمد کے شہر میں آئے تو وہاں کے مشائخ آپ کی ملاقات کے لئے گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہمیں شیخ کی ملاقات کو جانا چاہئے اور ساتھ ہی شیخ حسین کی نسبت بھی سلب کرلی۔ اس نسبت کی سلبی سے شیخ بہت پریشان ہوتے اور اونٹ پر سوار ہو کر نسبت کی خوشبو کے پیچھے چل دیئے۔ ادھر سے مولانا بھی شیخ کی طرف چل پڑے تھے۔ شیخ، مولانا سے جتنا قریب ہوتے جاتے اسی قدر گم شدہ نسبت کی بو تیز ہوتی جاتی۔ جب راہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی، تو وہ نسبت کی بو وہیں منقطع ہو گئی، تب جا کر شیخ کو معلوم ہوا کہ میری نسبت مولانا نے اپنے تصرف سے سلب کر لی ہے۔ شیخ نے بڑی انکساری سے کہا، مجھے علم نہ تھا کہ یہ اقلیم آپ کے زیرِ حکومت ہے۔ اب میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ مولانا کو شیخ پر رحم آگیا اور سلب شدہ نسبت واپس دے دی۔ شیخ نے اسے غنیمت سمجھا اور اپنے وطن کو واپس ہوئے۔"

(صوفیائے نقشبند، ص ۱۸۵)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ ہمارے اولیاء اللہ اپنی نمود و نمائش کے لئے بڑے حریص واقع ہوئے ہیں اور فوراً مقابلہ پر بھی اتر آتے ہیں اور اپنے سے کم تر کے تصرفات چھین کر ان سے اپنی ولایت کا سکہ تسلیم کروا کے چھوڑتے ہیں۔

۲۔ نسبت کی سلبی غالباً تصرفات کی سلبی سے بڑی سزا ہے۔ کیونکہ تصرفات میں بو نہیں ہوتی جبکہ نسبت میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔ اگر نسبت سلب ہو جائے، تو اس کی خوشبو کے پیچھے چلنے سے یوں سراغ لگایا جا سکتا ہے جیسے چور کا اس کے پاؤں کے نشانات سے۔

۳۔ تصرف یا کرامات اور ولایت لازم و ملزوم ہیں۔ پھر جتنا زیادہ صاحب تصرف کوئی ولی ہوگا، اتنا ہی وسیع علاقہ اس کے زیرِ حکومت ہوگا، گویا تصرف حکومت (باطنی) بھی لازم و ملزوم ہوئے۔

۵۔ پیر شمس اور بہاؤالدین زکریا کی کرامتوں کا مقابلہ

فرقہ اسماعیلیہ (شیعہ امامیہ) کے ایک مبلغ پیر شمس الدین سبزواری تبریزی (م ۷۵۰ھ) کا ذکر ہو رہا ہے:۔

"حضرت پیر شمس کی شہرت بڑھنے سے بہاؤالدین زکریا نامی ایک درویش کو اپنی عزت کی نسبت ڈر پیدا ہوا۔ گلزار شمس کی روایت کے بموجب اس نے اپنے خاص مرید خان محمد سید حاکم شہید کو حکم دیا کہ پیر شمس ملتان آئیں گے تو ہمیں بھی ان کی اطاعت کرنی پڑے گی اس لیے تمام کشتیوں کو شہر میں لے لو تاکہ وہ شہر میں داخل نہ ہو سکیں۔ مرید نے اس حکم پر عمل کیا اور جب پیر شمس

نے کنارہ پر آکر دیکھا تو ایک بھی کشتی نظر نہ آئی۔ بے حد غصہ آیا۔ ایک کاغذ کی کشتی بنائی اس میں خود بیٹھ گئے اور کشتی کے ساتھیوں کو اپنی انگلی پکڑنے کے لیے کہا۔ سبھوں نے اس پر عمل کیا۔ کشتی اسی وقت ندی میں بہنے لگی۔ مگر چکر کھانے لگی۔ پیر شمس نے دریافت کیا کہ کسی کے پاس دنیوی مال و متاع ہے کیا؟ شاہزادہ محمد کو ان کی والدہ نے زادِ راہ کے لیے چند زیورات دیئے تھے اس کو انہوں نے پیر شمس کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے ان جواہرات کو دریا میں پھینکوا دیا۔ ویسے ہی کشتی ندی میں بہنے لگی اور جب بیچ میں پہنچی تو بہاؤالدین زکریا کی نظر اس پر پڑی اور اس نے بد دعا دی اس لیے کاغذ کی کشتی وہیں رک گئی۔ پیر شمس بہت حیران ہوئے آخر ان کی نظر بہاؤالدین زکریا پر پڑی جو کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ میری کشتی اس نے روکی ہے۔ پیر شمس نے اس کی طرف جونہی نظر اٹھائی تو بہاؤالدین کے سر پر دو سینگ پیدا ہو گئے۔ اور سر کھڑکی میں اٹک گیا۔ بہاؤالدین اس مصیبت سے گھبرا گیا اور اپنے دو بیٹوں کو معافی کے لیے پیر شمس کے پاس بھیجا۔ ان لڑکوں کی مسجد قدیم میں پیر شمس سے ملاقات ہوئی۔ لڑکوں نے والد کی طرف سے معافی مانگی پیر شمس نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔ اس طرح بہاؤالدین کو اس مصیبت سے نجات ملی آج تک وہ دونوں سینگوں کی نشانی ان کے ذکور فرزندوں میں باقی ہے۔ اور وہ کھڑکی بھی موجود ہے جس میں بہاؤالدین بیٹھا تھا۔ ملتان شہر کے سیاحت کرنے والوں کو یہ چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

اب دیکھئے درج بالا کرامت دراصل بہت سی کرامات کا یا خرق عادت امور کا مجموعہ ہے، مثلاً:-

۱۔ آج تک اتنا چوڑا کاغذ ایجاد نہیں ہوا جس کی اگر کشتی بنائی جائے تو آدمی اس میں بیٹھ سکے مگر پیر شمس کو ایسا کاغذ مل گیا تھا۔

۲۔ پھر وہ کاغذ اس قدر واٹر پروف تھا کہ پانی میں گلتا تک نہ تھا۔

۳۔ نیز وہ کاغذ اس قدر مضبوط اور توازن بدوش تھا کہ پیر شمس کے اس میں بیٹھنے اور ساتھیوں کے پیر شمس کی انگلی پکڑنے یعنی کئی آدمیوں کا بوجھ اٹھانے کے باوجود نہ ٹوٹا۔ اور نہ ہی ان کو لے ڈوبا۔

۴۔ اتنے پائیدار کاغذ کے ناؤ کے چکر کھانے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ خواجہ خضر خواج جسے اولیاء اللہ کی دنیا میں پانیوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے کا نذرانہ پیر شمس نے نہ دیا تھا چنانچہ پیر شمس نے شاہزادہ محمد سے چند زیور لیے۔ لیکن جب پھینکے تو وہ زیور کے بجائے جواہرات بن گئے ان جواہرات کے ملنے پر خواجہ خضر خوش ہو گئے۔ اور کشتی کو آگے چلنے دیا۔

۵۔ پیر شمس کی نظر جلالت پڑنے پر بہاؤالدین زکریا ملتانی کے سر پر دو سینگوں کا اسی وقت اگ آنا بھی بڑی عالی شان کرامت ہے معافی مانگنے پر یہ سینگ تو غائب ہو گئے۔ لیکن یہ کلنک کا ٹیکہ ان کی اولاد ذکور میں باقی رہ گیا کہ کیسے ہمارے جدامجد بہاؤالدین زکریا ملتانی نے شکست کھائی تھی۔

۶۔ شیخ خرقانی اور شیخ ابوالعباس کا آگ میں کودنے کا مقابلہ

اس مقابلہ کی تفصیل ہم آگے کرامات اور استدراج کے ذیلی عنوان "یا نار کونی برداً وسلاماً" کے تحت درج کر رہے ہیں، وہاں دیکھ لی جائے۔

کشف و کرامات کے حصول کا بہترین نسخہ

جب ولایت اور کشف و کرامات کے لازم و ملزوم ہونے کا عقیدہ ہمہ گیر شکل اختیار کر گیا، تو ضروری تھا کہ جوئندہ یابندہ کے مصداق کشف و کرامات یا ولایت کے حصول کے طریقے بھی دریافت کئے جاتے چنانچہ ان "اولیاء اللہ" نے ایسے سینکڑوں اوراد واذکار اور وظائف بھی ایجاد کر لئے۔ نمونۃً ایک نسخہ حاضر خدمت ہے۔ صاحب ریاض السالکین "اسم اعظم" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ وظیفہ مخدوم جہانیاں جلال الدین جہاں گشت کا ہے۔ اس اسم اعظم سے نو ہزار کشف و کرامات حاصل ہوتی ہیں۔ ترکیب اس کی یہ ہے کہ اول ترکِ حیوانات جلالی و جمالی کرے اور ہر وقت پاکیزہ باطہارت رہے۔ ایک کروڑ مرتبہ "اللہ الصمد اجب یا اسرافیل یا مدد فائیل" اول آخر درود شریف پڑھے اور ایک تعداد مقرر کر کے روزانہ اسی تعداد کے مطابق ایک ہی جانماز پر وظیفہ کرے۔ جب ۲۵ لاکھ پورا ہو چکے، تو اس کا ثواب تمام پیغمبروں کی روحوں کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا کر کے اس کا ثواب حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روح کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا ہونے پر اس کا ثواب تمام شہیدوں اور غوث، قطب، ابدال اور تمام برگزیدہ بزرگوں کی ارواح کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا ہونے پر اس کا ثواب تمام امتِ رسول اور جمیع مسلمانوں کی ارواح پاک کو پہنچائے۔ بس عمل پورا ہو گیا..... تین مرتبہ یا گیارہ مرتبہ اسم اعظم پڑھ کر جو چاہے فوراً حاضر ہو۔ تمام کائنات تسخیر میں ہو گی۔ تین ماہ گزرنے کے بعد بے شمار کشف و کرامات حاصل ہوں گے، لیکن حلال و حرام کی تمیز ہو۔ ناجائز، خلافِ شرع کوئی بات سرزد نہ ہو..... یہ میرا آزمودہ ہے۔ نااہل کو اس کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ مجھے اس کی اجازت سید محمد عبداللہ نے ۱۹۳۰ء میں دی تھی۔ ہر چیز ارضی و سماوی تابع فرمان ہو گی۔ یہ اسم اعظم ننگی تلوار ہے بغیر اجازت مرشد کامل ہرگز نہ پڑھے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۵۴)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ اس وظیفہ کے موجد جلال الدین مخدوم جہانیاں ، اجازت دہندہ سید محمد عبداللہ اور راقم کتاب مذکورہ "مرشدین کامل" ہیں۔

۲۔ ان تینوں کے نزدیک اللہ الصمد کے ساتھ ساتھ "اَجِبْ یا اسرافیل یا مدد فائیل" بھی اسم اعظم کا حصہ ہے ، جو صریح شرک ہے اور یہی رجال الغیب سے استمداد ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک یہ خلافِ شرع کیا عین شرع کے مطابق ہے۔

۳۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ اس شرکیہ وظیفہ میں یہی حصہ "اَجِبْ یا اسرافیل یا مدد فائیل" ہی اصل الاصول ہے کیونکہ ہندو جوگی اور سادھوؤں سے بھی بے شمار کرامات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بھی اپنے جنتر و منتروں کے ذریعے رجال الغیب سے استفادہ کرتے ہیں اور 'اللہ الصمد' کے قائل بھی نہیں ہوتے۔

۴۔ یہ حرام حلال کی تمیز اور طہارت وغیرہ کی پابندیاں بھی محض تقدس پیدا کرنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ کیونکہ دوسرے مذاہب کے مرشدانِ کامل ایسی پابندیاں روا نہیں رکھتے اور اس کے باوجود کشف و کرامات کے ماہر ہوتے ہیں۔

۳۔ اولیاء اللہ کی اقسام

تعلیم و تربیت یا کرامات کے صدور کے لحاظ سے ان اولیاء اللہ کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں:

۱۔ مادرزاد ولی

مختلف تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پہلے مادر زاد ولی سید الطائفہ ، بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) تھے۔ آپ کی والدہ سے روایت ہے "جب کبھی میں شبہ کا لقمہ کھا لیتی تو اندر بے قراری شروع ہو جاتی تھی۔ اور تاوقتیکہ قے نہ کر دیتی آرام نہ آتا تھا۔" (صوفیائے نقشبندؒ)

آپ کا سلسلہ طریقت امام جعفر صادق سے ملایا جاتا ہے۔ جنہیں آپ نے دیکھا بھی نہیں یعنی آپ امام موصوف کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ (حوالہ ایضاً)

۲۔ علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ) "اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ شیخ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ لڑکپن میں بھی کبھی دن میں ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ اسی وجہ سے مادر زاد ولی کہلاتے ہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت ص ۱۴۹)

۳۔ خواجہ محمد یا ابو محمد (م ۱۱۴ھ) "آپ کا لقب ولی الدین یا ناصح الدین تھا، مادر زاد ولی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حمل کے زمانہ میں والدہ کے پیٹ سے ذکر اللہ کی آواز آئی تھی، پیدا ہوتے ہی سات مرتبہ کلمہ پڑھا۔ ایام رضاعت میں مشغول بذکر رہتے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، از مولانا زکریا، ص ۱۵۵)

۴۔ شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) "آپ کی والدہ بھی صاحب کشف کرامات تھیں۔ آپ فرماتی ہیں "رمضان بھر میں کبھی دودھ منہ میں نہیں لیا"۔ ایک روز مطلع ابر آلود تھا۔ چاند نظر نہ آسکا۔ لوگوں نے آکر مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ "آج دن بھر میرے لڑکے عبدالقادر نے دودھ نہیں پیا ہے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ اس دن رمضان کی پہلی تاریخ تھی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۹)

اگرچہ لوگوں کو اس کرامت سے کوئی فائدہ نہ ہوا، ان کا روزہ تو قضا ہو ہی گیا تھا۔ تاہم آپ کی یہ کرامت مشہور ہوگئی۔ اس کرامت کے لحاظ سے مشائخ چشت سبقت لے گئے کہ ان کے علو ممشاد دینوری ایک تو بہت پہلے کے ہیں (م ۲۹۸ھ) دوسرے وہ رمضان کے علاوہ بھی دن بھر میں ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ یعنی پیدائش سے ہی صائم الدہر تھے۔

۵۔ خواجہ امیر کلال (م ۷۷۲ھ) "ایام حمل میں اگر آپ کی والدہ محترمہ کوئی مشتبہ لقمہ کھا لیتیں تو پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور جب تک وہ نکل نہ جاتا، چین نہ آتا تھا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۵۷)

۶۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) "آپ مادر زاد ولی تھے۔ بچپن ہی میں صاحب کرامات ہو گئے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت از مولانا زکریا، ص ۱۹۴)

۷۔ شاہ بلاول قادری لاہوری (م ۱۰۴۶ھ) "محبوب الواصلین میں مرقوم ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ سات برس کا سن تھا کہ ان کا ایک ہم عمر لڑکا فوت ہو گیا۔ آپ یہ سن کر اس کے سرہانے گئے اور کہا "اے یار! بے وقت سونا اچھا نہیں ہے آؤ چل کر کھیلیں۔ لڑکے نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر ساتھ چلا گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۴۳)

۸۔ خواجہ خاوند المعروف حضرت ایشاں (م ۱۰۵۲ھ) "آپ مادر زاد ولی اور قطب الارشاد بزرگ تھے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۶۱) تذکرہ نویس نے ثبوت کے لئے کوئی کرامت بیان نہیں فرمائی۔

۹۔ محمد نوشاہ گنج بخش (م ۱۱۰۳ھ) آپ مادر زاد ولی اللہ صاحب جذب (مجذوب) صحو و سکر

اور محبت عشق اور شوق و ذوق اور زہد و ریاضت تھے۔ ولایت کے بادشاہ اور صاحب خوارق و کرامات تھے۔ طریقہ نوشاہیہ قادریہ کے امام اور پیشوا تھے۔" .... آپ نو ماہ کی عمر میں جھولے میں تھے کہ ایک ہمسائی نے آکر آپ کو گود میں لینا چاہا۔ دیکھا تو ایک سیاہ سانپ حضرت نوشاہ عالی جاہ کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور چلائی۔ آپ کی والدہ بی بی جیونی چیخ سن کر دوڑی آئیں دیکھا تو کوئی سانپ نہیں تھا حیران ہو گئیں۔ اسی اثنا میں گوشہ سے آواز آئی کہ "یہ عورت ناپاک حالت میں چاہتی تھی کہ ہمارے جسم کو ہاتھ لگائے۔ اس لئے اس کام سے اس کو باز رکھا۔ حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۶۸)

یہ کرامت تو بہت خوب ہے مگر یہ سمجھ نہیں آسکی کہ یہ گوشہ سے آواز دینے والا کون تھا جو آپ کے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ نیز یہ کہ کونسی شریعت میں ناپاک عورت کا بچے کو ہاتھ لگانا منع ہے۔

۱۰۔ نور محمد تیراہی المشہور بابا جیو (م ۱۲۸۵) یہ بھی مادر زاد ولی ہیں (صوفیائے نقشبند، ص ۲۸۶) ان کے مادر زاد ولی ہونے کی وجہ تذکرہ نویس نے بیان نہیں فرمائی۔ غالباً یہ وہی ولی ہیں جنہوں نے اولیائے ہندوستان اور اولیائے افغانستان کے درمیان مقابلہ رچایا تھا اور ایک پتھر پر بسم اللہ کی ضربات لگانے سے اس کو حرکت میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اولیائے ہندوستان (نقشبند) کی لاج رکھ لی تھی۔

۱۱۔ میاں شیر محمد شرقپوری (م ۱۳۴۷ھ) "عام طور پر مشہور ہے اور دیکھنے والے معتبر اور مستند راوی بیان کرتے اور لکھتے ہیں کہ آپ کے پیدا ہوتے ہی جسم اطہر اور چہرہ نورانی سے ولی کامل ہونے کے آثار روزِ روشن کی طرح ظاہر تھے اور ہر شخص جو حضرت کو دیکھتا تھا، بے اختیار پکار اٹھتا تھا کہ یہ بچہ تو مادر زاد ولی ہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۳۵۹)

مندرجہ بالا اقتباسات سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ اگرچہ بعض اولیائے کرام کشف و کرامات کو ولایت کے لئے لازم قرار نہیں دیتے، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ اس طبقہ میں ان کی یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی ہے۔ ابتداء سے لے کر آج تک عمومی ذہن یہی رہا ہے کہ ولایت اور کرامات لازم و ملزوم ہیں۔ جس میں کرامت نہیں وہ ولی کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اِن مادر زاد ولیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو احکام شریعت کا پاس رکھنا تو درکنار، شرعی کبائر میں مبتلا تھے۔